جامعہ مدنیہ لاہور کا ترجمان

Scanned

علمی دینی اور اصلاحی مجلہ

انوارِ مدینہ لاہور

بیاد

عالمِ ربانی محدثِ کبیر حضرۃ مولانا سید حامد میاں رحمہ اللہ

بانی جامعہ مدنیہ

نگران

مولانا سید رشید میاں مدظلہ

مہتمم جامعہ مدنیہ، لاہور

رجب المرجب ۱۴۱۳ھ

جنوری ۱۹۹۳ء

اِس شمارے میں

حرفِ آغاز ____________ ۳

نبوت ____ مولانا سید محمد میاں ____________ ۶

شناختی کارڈ ____ محمد فاروق قریشی ____________ ۱۲

اسراؤ معراج ____ حضرت علامہ مولانا شمس الحق ____________ ۲۰

شب معراج (نظم) احسان دانش ۲۷

اسلام اور سائنس ____ حضرت مولانا مفتی محمود ____________ ۲۸

مزارعت ____ حضرت مولانا سید حامد میاں ____________ ۳۳

جمہوریت ... ____ حضرت مولانا سید محمد میاں ____________ ۳۵

مولانا سید حسین احمد مدنی ____ حافظ تنویر احمد شریفی ____________ ۳۹

تیاری کرو (نظم) ____ سید امین گیلانی ____________ ۴۴

دارالافتاء ____ مولانا مفتی عبدالواحد ____________ ۴۵

ثمرات الاوراق ____ مولانا نعیم الدین ____________ ۴۹

سرگزشت محمد علی خان ____ مولانا سید محمد میاں ____________ ۵۴

رابطہ کے لیے

دفتر ماہنامہ "انوارِ مدینہ" جامعہ مدنیہ کریم پارک لاہور کوڈ ۵۴۰۰۰

فون ۲۰۱۰۸۶ - ۲۰۵۳۸۸

سید رشید میاں طابع و ناشر نے شرکت پرنٹنگ پریس لاہور سے چھپوا کر

دفتر ماہنامہ "انوارِ مدینہ" جامعہ مدنیہ کریم پارک لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرفِ آغاز

سیّد محمود میاں

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم اما بعد

۶ دسمبر ۱۹۹۲ء ایودھیا بھارت میں تقریباً ساڑھے چار سو سال قدیم تاریخی بابری مسجد کی متعصب ہندو غنڈوں کے ہاتھوں شہادت نے ایک طرف تو ہندوستان کے سیکولر ہونے کے دعوے کی قلعی کھول دی۔ اور دوسری طرف یہ حادثہ دُنیا بھر کے مُسلمان ممالک کے لیے ایک کھُلا چیلنج ہونے کے ساتھ ساتھ بھارت میں آباد بائیس ۲۲ کروڑ مسلمانوں کی زندگی اور موت کا مسئلہ بھی بن گیا جو ہر ادنیٰ سی ایمانی حرارت رکھنے والے انسان کی غیرتِ ایمانی کو بیدار کرنے کے لیے بہت کافی ہے۔ بھارتی سرکار لاکھ صفائیاں پیش کرے، اس کھُلے جرم سے پاکیٔ داماں پر ہزاروں دلیلیں دے، مگر بھارت کی دھرتی سے اُٹھنے والا یہ سیاہ بادل ایک کروڑ کشمیریوں پر گزرنے والے مظالم سکھوں کی سب سے مقدس عبادت گاہ دربار صاحب پر بھارتی فوج کی باقاعدہ گولہ باری اس کے سیکولرازم کے ہمیشہ سے داغدار چہرہ کو روسیاہی کے سوا کچھ نہ دے گا۔ اس حساس مسئلہ پر وہاں کی مرکزی اور صوبائی حکومت کی جانب داری کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں۔ اتنی بڑی مسجد کو چند گھنٹوں میں شہید کرنا پھر تباہ شُدہ مسجد کے ملبہ کو صاف کرنا اور وہاں بغیر مداخلت کے فوراً ہی مندر تعمیر کر ڈالنا اور اس تمام عمل کے لیے ضروری وسائل کی فراہمی ہونا درپردہ سرکاری منصوبہ بندی کے بغیر ممکن نہ تھا۔ بی بی سی کے نمائندہ کی رپورٹ کے مطابق جب چند نوجوان مسجد میں کُودے اور گنبدوں کو شہید کیا تو وہاں موجود پولیس کا اُن کو روکنا تو درکنار بلکہ موقع واردات سے دُور جاتے

دیکھا گیا، جبکہ ایودھیا کی گلیوں میں "رام چندر جی کی جے" کے نعرے لگانے والوں میں پولیس اہلکار بھی شریک تھے اس کے علاوہ بہت سے شواہد ہیں جو بھارتی حکومت کی مجرمانہ غفلت پر شاہد ہیں۔ خود الہ آباد ہائی کورٹ نے بابری مسجد میں مندر کی تعمیر کے خلاف حکم امتناعی جاری کر رکھا تھا جس کی سپریم کورٹ نے نہ صرف توثیق کی بلکہ یوپی کی صوبائی حکومت کو پابند کیا کہ مسجد کی حدود میں کسی قسم کی تعمیر یا تخریب نہ کرنے کو یقینی بنایا جائے۔

دوسری طرف پاکستانی حکومت بھی بھارت کا سب سے قریبی ہمسایہ ہونے کے ناطے اس افسوس ناک سانحہ کی کافی حد تک ذمہ دار قرار پاتی ہے، کیونکہ یہ کوئی بالکل اچانک رونما ہونے والا حادثہ نہ تھا، بلکہ گزشتہ چند برسوں سے نہ صرف اخباروں میں لے دے ہوئی بلکہ بھارت میں ہندو متعصبین کے عملی اقدامات اور پُر تشدد بیانات نے مسلسل فضا کو مکدر کیے رکھا جس کی روشنی میں اگر حکومتِ پاکستان بروقت مناسب عملی اقدامات کر کے عالمی رائے عامہ بالخصوص مسلم ممالک کے ذریعہ بھارت پر اخلاقی سیاسی دباؤ ڈالتی تو عین ممکن ہے اس قسم کا حادثہ پیش ہی نہ آتا اور اگر آتا بھی تو اس کی نوعیت اور شدت اس قدر شدید تو ہرگز نہ ہوتی۔

○

پاکستان میں اس پر جو شدید عوامی ردِّ عمل ہوا ہے اور ہونا بھی چاہیے حکومتِ وقت کا فرض تھا کہ اس کو مثبت لائنوں پر قائم رکھتی نہ یہ کہ خود حکامِ بالا اُس کی منفی راہیں ہموار کرتے، بلکہ اسلام کی اعلیٰ تعلیمات کے برخلاف بذاتِ خود حکومت کے ایک وزیر نے جلوس کی قیادت کرتے ہوئے مندر کو اپنے ہاتھوں مسمار کر کے ایک بُری مثال قائم کی اور یہ خیال نہ کیا کہ ہماری اس وقتی تسکین کے ردِّ عمل میں ہندوستان میں بے بس و لاچار مسلمانوں پر مزید کیا کچھ گزرے گا؟

اللہ تعالیٰ تمام عالم میں مظلوم مسلمانوں کی مدد فرمائے اور اکابرینِ ملّت کو اسلامی تعلیمات پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

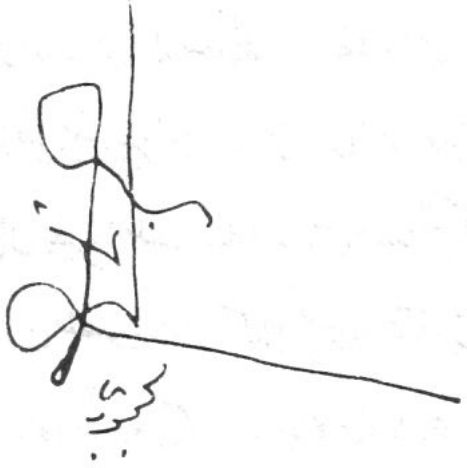

موت العالِم موت العالَم

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

اس سال کو اگر علمی دُنیا کے لیے عام الحزن (غم کا سال) قرار دیا جائے تو بجا ہوگا۔ سال رواں میں نہ جانے علمی دُنیا کے کتنے چمکتے ستارے غروب اور کتنے ہی جلتے چراغ گُل ہو گئے۔ بہت سے مفسّر، محدّث، مؤرخ اکابر اور مشائخ چلے گئے۔ ابھی گزشتہ ماہ بہت سے بزرگوں کا تعزیت نامہ لکھ کر قلم خشک بھی نہ ہونے پایا تھا کہ اس ماہ مزید دو بزرگوں کے دُنیا سے پردہ فرما جانے کی خبر آگئی۔ ان میں سے ایک شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی صاحب قدس سرہ العزیز کے خلیفہ حضرت مولانا محمّد اسحٰق صاحب قادری رحمہ اللہ ہیں۔ موصوف انتہائی سادہ اور متواضع بزرگ تھے، قال اللہ وقال الرسول کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا۔ نہایت سادگی کے ساتھ گوشہ خمول میں زندگی گزار رہے تھے، کافی عرصہ سے بیمار تھے، تقریباً ایک سال سے فالج کی شکایت تھی جس کی وجہ سے بولنا چالنا بالکل بند تھا۔ وفات سے دو روز قبل حضرت درخواستی مدظلہ العالی عیادت کو تشریف لائے تو خدا کی شان کہ اُن سے بات چیت کی، بعد میں پھر بولنا بند ہوگیا جس شب انتقال ہُوا۔ وفات سے تقریباً دو گھنٹے قبل ذکر اسم ذات شروع کر دیا جو صاف سُنائی دیتا تھا ذکر کرتے کرتے رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ انّا للہ وانّا الیہ راجعون جامعہ حنفیہ قادریہ باغبانپورہ اور جامع مسجد امن نیز متعدد شاگرد آپ کی یادگار ہیں، دُعا ہے اللہ تعالیٰ آپ کے خلف الرشید مولانا جمیل الرّحمٰن صاحب کو آپ کا صحیح جانشین اور آپ کے مشن کا صحیح وارث بنائے۔ آمین۔

دوسرے بزرگ معروف عالم دین حضرت مولانا محمّد علی صدّیقی کاندھلوی رحمہ اللہ ہیں۔ آپ کا اصل وطن کاندھلہ ضلع مظفر نگر انڈیا تھا۔ تقسیم سے پہلے پاکستان تشریف لے آئے۔ ۱۹۳۶ء میں آپ سیالکوٹ کے مشہور و معروف مدرسہ دارالعلوم شہابیہ سے وابستہ ہُوئے اور اس مدرسہ کی تعمیر و ترقّی میں اپنی زندگی صرف کر دی۔ موصوف اپنے شہر سیالکوٹ میں ہر مکتبۂ فکر کے لوگوں میں عزّت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، آپ کی شخصیّت نہایت دلکش، مرنجامرنج اور ہر دلعزیز تھی، پیرانہ سالی کے باوجود ہنستے مُسکراتے صحّت مند نظر آتے تھے، تدریس و تقریر کے ساتھ تحریر میں بھی ملکہ حاصل تھا۔ مختلف موضوعات پر بہت سی کتابیں آپ کی یادگار ہیں جن میں سے اہم تفسیر "معالم العرفان"

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

نبوّت

حضرۃ شیخ الحدیث مولانا سید محمدؐ میاں رحمہ اللہ کی تصنیف لطیف سیرۃ مبارکہ محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کے چند اوراق

آپ اسی غار میں تھے کہ ایک وجود نمودار ہوا۔ اس سے گھبراہٹ نہیں ہوئی، بلکہ دل کو سکون ہوا۔ جیسے سوکھے ہونٹوں کو ٹھنڈا پانی مل گیا۔

اس نے فرمائش کی اِقْرَاْ پڑھو۔

حضرت محمدؐ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے۔ آپ نے عذر پیش کر دیا۔ میں پڑھنا نہیں جانتا۔ اس وجود نے دوبارہ یہی کہا۔ اِقْرَاْ پڑھو۔ اس مرتبہ بھی حضرت محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کا وہی عذر تھا۔ اس وجود نے تیسری مرتبہ یہی کہا۔ اس مرتبہ جواب میں حضرت محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلّم) نے فرمایا کیا پڑھوں۔ اس وجود نے یہ آیتیں پڑھوائیں۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ ۝

ترجمہ: پڑھ[لہ] اپنے رب کے نام سے جس نے (ساری مخلوق کو) پیدا کیا۔ بنایا انسان کو لہو کی پھٹکی (جمے ہوئے خون) سے پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے علم سکھایا قلم سے سکھایا آدمی کو جو نہ جانتا تھا۔

لہ یہ آیت ۶۲۲ء میں نازل ہوئی۔ یعنی ساتویں صدی عیسوی کے شروع میں جو یورپ کے قرونِ وسطیٰ کا تاریک ترین زمانہ تھا، جب مغربی یورپ پر جہالت کی گہری گھٹا چھائی ہوئی تھی، مشرقی یورپ میں کچھ تعلیم کا چرچا تھا تو اس کو کلیسا اپنی مخصوص جائداد سمجھ رکھا تھا کسی کی کیا مجال تھی کہ دست درازی کر سکے۔ ہندوستان میں جو کچھ علم تھا وہ چند گھرانوں کی ملک تھا کسی غیر تک اگر بھنک پہنچ جاتی تو اس کے کانوں میں سیسہ پلا دیا جاتا تھا۔ انصاف پسندوں کو اس سے سبق لینا اور مسلمانوں کو گریبان میں منہ ڈال کر دیکھنا چاہیے کیا واقعی ہم علم کے دلدادہ ہیں۔

آپ نے یہ آیتیں پڑھیں۔ آیتیں ذہن نشین ہوگئیں، مگر ساتھ ساتھ ذمّہ داری کا احساس بھی ہُوا۔ ایک طرف اپنی عاجزی کا غیر معمولی احساس تھا۔ آپ کی خصوصیت[1] یہ تھی کہ اپنے آپ کو کچھ نہیں سمجھتے تھے ہیچ در ہیچ سمجھتے تھے۔ دوسری طرف اتنی بڑی ذمّہ داری، اور ایسی ذمّہ داری جس کا کوئی تجربہ اب تک نہیں تھا۔ یعنی بھٹکی

---

[1] انسان کا دوسرا نام ہے "عبد" (بندہ) چونکہ انسان اپنے خالق کا مخلوق اور بندہ ہے اور یہی اس کی حقیقت ہے تو جو نام اس کی فطرت کے مطابق ہے وہ "عبد" ہے اور فطرتِ عبد کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے جذبات اور اس کا ہر ایک عمل اور کردار عبدیت اور نیازمندی کے سانچہ میں ڈھلا ہُوا ہو۔ اس بنا پر عبدیت (بندگی) اور نیازمندی کو عبد (بندہ) کا سب سے اعلیٰ کمال سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ جس درجہ معبُود کی عظمت کا احساس ہوگا۔ اتنا ہی اپنی عبدیت اور نیازمندی کا احساس ہوگا اور جو معرفت الٰہی اور خدا شناسی میں کامل و مکمل ہوگا۔ وہ اپنی بندگی نیازمندی ہیچ در ہیچ اور بے حقیقت ہونے کے احساس میں بھی سب سے بڑھا ہُوا ہوگا اور کامل و مکمل ہوگا۔ یہ عبدیت آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی مخصوص صفت اور ایسی محبوب و مقبول خصلت ہے کہ حیات مبارکہ کے وہ تمام واقعات جو روحانیت روحانی عروج یا وحی اور تنزیل کے لحاظ سے خاص اہمیّت رکھتے ہیں ان میں آپ کے لیے (صلّی اللہ علیہ وسلّم) لفظ عبد ہی لایا گیا ہے اور آپ کو عبد ہی سے تعبیر کیا گیا ہے مثلاً سورہ اقرأ جس سے وحی کا آغاز ہُوا۔ اس میں ہے ارأیت الّذی ینھٰی عبدًا اذا صلّی۔ نزولِ قرآن کے سلسلہ میں ہے۔ تبارك الّذ نزل الفرقان علیٰ عبدہٖ (الفرقان) سورۂ کہف میں ہے۔ الحمد للہ الّذی انزل علی عبدہ الکتاب۔ اعجاز قرآن کے سلسلہ میں ارشادِ ربانی ہے۔ وان کنتم فی ریب مما نزلنا علیٰ عبدنا۔ جنّات نے قرآن شریف سُنا وہ ایمان لائے۔ اس سلسلہ میں ارشادِ ربّانی ہے۔ انہ لما قام عبداللہ یدعوہ الآیۃ (سورۂ جن) اسرأ جو حیاتِ مقدسہ کی سب سے زیادہ ممتاز مخصوص شان ہے، وہاں ارشاد ہُوا۔ اسریٰ بعبدہ لیلاً معراج میں دیدار باری اور مکالمہ ربانی کا شرف حاصل ہوا تو اس کا تذکرہ کرتے ہُوئے ارشاد ہے۔ فاوحیٰ الیٰ عبدہٖ ما اوحیٰ (نجم) جو کلمہ مدار ایمان قرار دیا گیا ہے اس میں ہے: اشھد انّ محمّدا عبدہ ورسولہ۔

بس یہ عبدیت ہی کا ظہور تھا کہ سب کچھ اور سب سے افضل ہونے کے باوجود آپ اپنے آپ کو ہیچ در ہیچ اور ایسا بے حقیقت سمجھ رہے تھے کہ بارِ امانت کے تصوّر سے بھی قلب مبارک لرز گیا اور ایسا لرزا کہ پورے جسم مبارک کو لرزا دیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔ حضرت الاستاذ مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے حضرت آدم علیہ السلام کی فضیلت ملائکہ کے مقابلہ میں علم سے ہُوئی اور شیطان کے مقابلہ میں عبدیت سے۔ شیطان سے باز پُرس ہُوئی کہ سجدہ کیوں نہیں کیا تو یہ اُس کی خود بینی اور خود پرستی تھی کہ اُس نے دعویٰ کیا انا خیر منہ حضرت آدم علیہ السّلام بھی اپنے فعل کی توجیہ

(باقی بر صفحہ آئندہ)

ہوئی مخلوق کو پڑھنے پڑھانے، تعلیم دینے اور[1] سدھانے کی ذمہ داری۔ اور ایسی صورت سے جو بالکل اجنبی صورت تھی، جس کا کبھی وہم و گمان بھی نہیں آیا تھا نہ کسی سے ایسی باتیں سُنی تھیں اس طرح کے خیالات اور غیر معمولی احساس کا اثر یہ ہُوا کہ دل کانپنے لگا۔ آپ مکان پر پہنچے تو لرزہ جیسی کیفیت تھی۔ آپ نے رفیقۂ حیات (حضرت خدیجہؓ) سے کہا:

میرے اُوپر کپڑا ڈال دو۔[2]

حضرت خدیجہؓ نے بلائیں لیں، پُوچھا کیا بات ہے؟ طبیعت کو سکون ہُوا تو آپؐ نے پُورا قصّہ سُنایا اور یہ بھی فرمایا۔ مجھے اپنی جان کا ڈر ہے (ایسی بڑی ذمّہ داری کس طرح اُٹھا سکوں گا)

حضرت خدیجہؓ سمجھ دار خاتون تھیں۔ حضرت محمّد (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو جس طرح پندرہ سال سے دیکھ رہی تھیں۔ ان کو یقین تھا کہ اس غیر معمولی شخص کے لیے کوئی غیر معمولی صورت نمودار ہوگی جس کی شان نرالی ہوگی۔

حضرت خدیجہؓ نے پُورا واقعہ سُنا۔ پھر وہ آیتیں سُنیں جن میں اس طرف اشارہ تھا کہ خدا قادر جو خُون کے لوتھڑے سے جیتا جاگتا انسان بناتا ہے۔ قلم کے ذریعہ لکھنا پڑھنا سکھاتا ہے۔ انسان کو وہ باتیں بتاتا ہے جن کو وہ خود اپنے ذہن سے نہیں معلوم کر سکتا تھا، وہ خدا قادر کسی اُستاد یا قلم کی مدد کے بغیر محض

(بقیّہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کر سکتے تھے، مگر آدم علیہ السّلام نے عجز و تواضع اور نیازمندی پیش کرتے ہُوئے اعتراف کر لیا ربنا ظلمنا انفسنا۔ اے ہمارے ربّ بلا شُبہہ ہم نے خود اپنے اُوپر ظُلم کیا ہے۔ یعنی اپنے قصور اور ظُلم کا اعتراف بھی ہے اور یہ بھی اعتراف ہے کہ اس ظُلم پر پردہ ڈالنے والا تیرے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ بس یہ نیازمندی اور عبدیت تھی جس نے شیطان کے مقابلہ میں حضرت آدمؑ کو مقبولِ بارگاہِ حضرتِ حق بنایا۔ واللہ اعلم بالصّواب

[1] اور اس امانت کی ذمّہ داری جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ انا عرضنا الامانۃ الخ سورہ احزاب آخری رکوع۔ ترجمہ: ہم نے پیش کی امانت۔ آسمانوں کے سامنے۔ زمین کے سامنے۔ پہاڑوں کے سامنے۔ ان سب نے اس کے اُٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے خوف کھا گئے اور اُٹھا لیا اُس کو انسان نے۔ (سورۂ احزاب آخری رکوع پ ۲۲)

[2] خود قرآنِ پاک کی عظمت اور اس کا وقار ایک با احساس کو لرزہ براندام کرنے کے لیے کافی ہے۔ ارشاد ربّانی ہے لو انزلنا ھذا القرآن علیٰ جبلٍ لرائیتہٗ الخ۔ اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو دیکھتا کہ "خدا کے خوف سے دَب جاتا اور پھٹ جاتا (سورۂ حشر آخری رکوع پ ۲۸)

اپنی قدرت سے علم کے دروازے آپ پر کھول دے گا۔

یہ آیتیں سُن کر حضرت خدیجہ (رض) کو یقین ہو گیا کہ جس غیر معمولی صورت کی توقع تھی وہ سامنے آگئی ہے۔

وہ اس واقعہ کے متعلق کوئی فیصلہ تو نہیں کر سکیں، البتہ حضرت محمدؐ نے جو خطرہ ظاہر کیا تھا کہ ان ذمہ داریوں کے بوجھ سے میری جان جاتی رہے گی۔ حضرت خدیجہ رضؓ نے اس کا اطمینان دلایا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ حضرت خدیجہؓ نے آپ کی زندگی کا مرقع پیش کر کے بہت لطیف پیرایہ میں اطمینان دلایا کہ آپ یہ بار اُٹھا سکیں گے۔ کیونکہ اب تک کی زندگی میں جو بوجھ اُٹھاتے رہے ہیں وہ کم نہیں ہیں، وہ بھی غیر معمولی ہیں۔ پس اگر کوئی اس سے بھی بڑی ذمہ داری آپ پر پڑے گی تو آپ اُس کو بھی اُٹھا سکیں گے۔

حضرت خدیجہ نے اطمینان دلاتے ہوئے فرمایا۔ کَلَّا وَاللّٰہ لَا یُخزیك اللّٰہ ابدا انك لتصل الرحم وتحمل الکل وتکسیب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق۔ (بخاری شریف ص۴۸)

ترجمہ: خدا شاہد ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا، کبھی ایسا نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ناکام کر دے۔ آپ کی مدد نہ کرے۔ آپ رشتہ داروں کا خیال رکھتے ہیں اُن کی مدد کرتے رہتے ہیں۔ ہارے، تھکے، درماندہ مسافروں کے لیے سواری کا انتظام کرتے ہیں، اُن کو منزل تک پہنچاتے ہیں آپ ایسے احسانات کرتے ہیں اور ایسی خدمات انجام دیتے ہیں جن کی نظیر نہیں ملتی، جو دوسری جگہ قطعاً نایاب ہیں۔ باہر کے مسافر جو بے ٹھکانہ ہوتے ہیں۔ آپ اُن کو اپنا مہمان بناتے ہیں۔ برپا ہونے والے ہنگاموں اور ناگہانی حوادث میں آپ حق کی حمایت کرتے ہیں۔"

حضرت خدیجہ رضؓ نے اس طرح تسلی دی، لیکن یہ اُن کی رائے اور اُن کا اپنا اعتقاد تھا کہ جو اس طرح صاحبِ خیر ہو، خدا کی طرف سے اس کی مدد ہوگی۔ اس کو ذلیل و رسوا اور ناکام نہیں کیا جائے گا، لیکن اس طرح کے معاملہ کی حقیقت وہ بھی نہیں جانتی تھیں، کیونکہ نبوّت اور الہام کی باتوں سے وہ بھی واقف نہیں تھیں۔ اُن کو ایک شخص کا خیال آیا۔ یہ حضرت خدیجہ رضؓ کے ہمجد تھے۔ رشتہ کے بھائی ہوتے تھے۔ عیسائی مذہب اختیار کیے ہوئے تھے عالم فاضل تھے، نبوّت اور الہام کی باتیں جانتے تھے۔ عبرانی زبان پر اُن کو عبور تھا۔ عبرانی کی اصل انجیل کا مطالعہ کیا کرتے تھے۔ عربی میں اس کا ترجمہ بھی کیا کرتے تھے۔ اب بہت بوڑھے تھے۔ بصارت سے بھی معذور ہو چکے تھے مگر لوگ اُن کی قدر کرتے تھے۔ اُن کا نام ورقہ تھا ولدیت نوفل۔

حضرت خدیجہ رضؓ، حضرت محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ساتھ لے کر اُن کے یہاں پہنچیں اور کہا آپ کے

برادرزادے (حضرت محمدؐ صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو عجیب صُورت پیش آئی ہے۔ یہ خود ہی بیان کریں گے۔ آپ غور سے سُنیے اور رائے دیجیے۔

حضرت محمدؐ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے پُورا واقعہ بیان کیا

ورقہ نے جیسے ہی سُنا برجستہ جواب دیا۔

یہ تو وہی ناموس[1] (فرشتہ) ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السّلام پر نازل فرمایا تھا۔

ورقہ نے کہا۔ مَیں بُوڑھا ہوگیا ہوں۔ کاش مَیں جوان ہوتا۔ کاش میں اس وقت تک زندہ رہوں جب آپ کی قوم آپ کو نکالے گی۔

حضرت محمدؐ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) نے سُنا کہ قوم اُن کو نکالے گی تو بہت تعجّب ہوا۔ یہ قوم جو یہاں تک گرویدہ ہے کہ عقیدت اور احترام میں نام لینا بے ادبی سمجھتی ہے، مجھ سے دُعائیں کراتی ہے اور بڑے معاملات کا فیصلہ کرنا میرے حوالے کردیتی ہے، کیا وہ ایسی آنکھیں پھیر لے گی کہ مجھے مکّہ سے نکال دے گی۔

حضرت محمدؐ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) جیسے محبوب رہنما کے لیے یہ بہت ہی عجیب بات تھی۔ آپ نے تعجب سے دریافت کیا۔ کیا میری قوم مجھے نکالے گی؟

ورقہ! بیشک آپ کو نکالے گی اور یہ انوکھی بات نہیں ہے جو شخص بھی ایسی بات پیش کرتا ہے جو آپ پیش کرنے والے ہیں، اس کے ساتھ قوم کا برتاؤ یہی ہُوا کرتا ہے۔ کاش میرے سامنے وہ دن آئے تو مَیں آپ کی پُوری پُوری مدد کروں۔

ورقہ تو زندہ نہیں رہے۔ کچھ دنوں بعد اُن کی وفات ہوگئی، مگر جو بات اُنھوں نے کہی تھی، وہ پُوری ہُوئی۔ (تفصیل آگے آئے گی۔)

یہ تھا نبوّت کا آغاز۔ اور یہ تھی وحی کی ابتدا۔ جس میں پڑھنے پڑھانے۔ علم اور قلم کا تذکرہ اور عالمانہ زندگی کی ترغیب ہے۔ (واللہ اعلم) ابتدائی ظہور کے بعد یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے لیے بند ہوگیا۔

ذوق وشوق

کہتے ہیں عشق برق خرمن سوز ہوتا ہے جو اپنے سوا، متاع ہستی کی ہر ایک نمود کو ختم کر دیتا ہے۔ رہتا ہے تو صرف عشق۔ مگر محبوب کی طرح محبوب۔ درد ہے مگر رگِ جاں سے زیادہ عزیز۔ عاشق کی تمنّا یہی رہتی ہے کہ یہ درد بڑھے وہ اپنے خاتمہ کی تمنّا کرسکتا ہے۔ مگر خاتمہ عشق

---

[1] راز دار فرشتہ فتح الباری۔

کا نام بھی زبان پر نہیں لاسکتا۔ کچھ ایسی ہی صُورت یہاں بھی ہُوئی۔ جس کیفیت کا ایک اثر یہ تھا کہ قلبِ مُبارک لرزنے لگا۔ اُسی کا دوسرا اثر یہ تھا کہ حضرت محمدؐ (صلّی اللہ علیہ وسلّم) کی تمنّا یہ ہوگئی کہ وہ کیفیت پھر میسّر آئے اس کا شوق یہاں تک بڑھا کہ آپ اس کے بغیر اپنی زندگی بیکار سمجھنے لگے۔ جب اس شوق کا غلبہ ہوتا تو آپ چاہتے کہ کسی پہاڑ کی چوٹی سے اپنے آپ کو گرا کر ختم کردیں[1] لیکن رحمتِ حق دستگیری کرتی۔ بہرحال جس قدرت نے آپ کو خاص مقصد کے لیے پیدا کیا تھا وہی رہنما بنی۔ اور کچھ عرصہ توقف کے بعد سلسلہ وحی شروع ہوگیا۔ یعنی ذوق وشوق، ذکر وفکر اور مراقبہ کا ضروری کورس پُورا ہوگیا تو وحی الٰہی کی بارش ہونے لگی جو مسلسل اکیس برس تک ہوتی رہی۔

---

[1] بخاری شریف ص ۱۰۳۴۔

○

بقیہ: موت العالِم

ہے۔ افسوس یہ سرمایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی۔ دوسری ضخیم کتاب "امام اعظم اور علم الحدیث" ہے جو آپ کے وسعتِ علم کا بہترین شاہکار ہے، نصف صدی سے زائد علم وعمل کی بہار دکھانے کے بعد ۲۰ جمادی الثانی ۱۴۱۳ھ بدھ اور جمعرات کی درمیانی شب کو آپ اپنے متوسلین کو تڑپتا چھوڑ کر اس دُنیا سے پردہ فرما گئے۔ انّا للہ وانّا الیہ راجعون۔ ۱۷، دسمبر بروز جمعرات سیالکوٹ کے مرے کالج کی وسیع وعریض گراؤنڈ میں آپ کی نماز جنازہ ہُوئی، جامعہ مدنیہ سے راقم الحروف اور مولوی نعیم الدین صاحب بھی جنازہ میں شریک ہُوئے، لوگوں کا ہجوم دیکھ کر اسلاف کے جنازوں کا نقشہ آنکھوں میں گھوم گیا، اللہ تعالیٰ آپ کے درجات کو بلند فرمائے اور آپ کے فیض کو جاری وساری رکھّے۔ آمین۔

جامعہ کے شب وروز

۱۴، جمادی الثانیہ مطابق ۱۰ نومبر ۱۹۹۲ء بروز جمعرات تقریباً گیارہ بارہ بجے کے دوران حضرت مولانا عبداللہ درخواستی صاحب مولانا اجمل خان صاحب مولانا فضل الرّحمٰن صاحب دیگر علماء کے ہمراہ جامعہ میں تشریف لائے۔ حضرت درخواستی مدّظلہ العالی نے طلبا سے خطاب کرتے ہُوئے مدرسہ کی کارکردگی کو سراہا۔ مدرسہ سے اپنے قدیم تعلّق اور مدرسہ کے بانی حضرت اقدس مولانا سیّد حامد میاں صاحب قدس سرہ العزیز اور اُن کے اخلاف کی تعریف کی اور مدرسہ کی ترقّی کے لیے دُعا فرمائی۔

از جناب محمّد فاروق قریشی ایم اے کراچی

شناختی کارڈ

میں مذہبی خانہ کے اضافہ پر اقلیّتوں کے شُبہات کا تجزیہ

دُنیا میں مواصلاتی نظام کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ ہر ملک نے اپنے شہریوں کے اختصاص اور شناخت کے لیے مختلف طریق اختیار کیے ہُوئے ہیں، پاکستان میں غالباً ۱۹۷۴ء میں شہریوں کی شناخت کے لیے شناختی کارڈ کا اجراء کیا گیا۔

شناختی کارڈ میں اس کے نمبر کے علاوہ شہری کا نام ولدیت، پتہ اور اس کی علامتِ شناخت کے ساتھ تاریخ پیدائش کا اندراج ہوتا ہے۔

اس کارڈ سے جہاں شہری سے متعلق بنیادی معلومات و شناخت کا علم ہوتا ہے وہاں اس کی مذہبی حیثیت بالکل معدوم رہتی ہے۔ حالانکہ یہ کسی بھی شہری کی بُنیادی شناخت ہے، کیونکہ مذہب سے وابستگی ہر شخص کی رضا کارانہ ہوتی ہے اور کوئی بھی شہری خواہ وہ کسی بھی مذہب کا پیرو ہو وہ اس کو اخفاء میں نہیں رکھتا۔ بے شمار مذہبی تقریبات اسی اظہار کے بُنیادی مقصد کے تحت منعقد ہوتی ہیں جس میں متعلقہ مذاہب کے پیرو بڑے تزک و احتشام کے ساتھ شرکت کرتے ہیں۔

مُسلمانوں کے مقدس ترین شہر مکہ اور مدینہ یعنی حرمین شریفین میں غیر مسلموں کا داخلہ قطعاً ممنوع ہے۔ چند برسوں سے یہ شکایات منظر پر آئیں کہ کچھ غیر مسلموں نے پاکستانی پاسپورٹ پر سفر کرتے ہُوئے خود کو مسلمان ظاہر کر کے حرمین میں نہ صرف داخل ہو گئے بلکہ وہاں کے قوانین کی خلاف ورزی میں ملوث ہو کر پکڑے گئے اور یُوں مملکت اسلامی پاکستان کی بدنامی اور رسوائی کا سبب بنے۔

پاکستان ایک اسلامی جمہوری مملکت ہے اور یہ صرف اسلام کے نفاذ کے لیے عمل میں لائی گئی۔ اسلام کی تعلیمات کے مطابق ہر وہ شخص جو نبی آخر الزمان صلّی اللہ علیہ وسلّم کے بعد بھی کسی شخص کی نبوّت کی ضرورت کا قائل ہو وہ مرتد ہے اور غیر مُسلم ہے۔ ۱۹۷۴ء سے قومی اسمبلی کے متفقہ فیصلے کے مطابق ختم نبوّت کے

منکرین پاکستان میں قانونی طور پر غیر مسلم ہیں لیکن وہ نہ صرف اپنے نام مسلمانوں جیسے رکھتے ہیں بلکہ بیرونی دُنیا میں اسلام کے نام سے خلقتِ خدا کو گمراہ کرتے ہیں اس لیے ضرورت محسوس کی گئی کہ شناختی کارڈ میں باقاعدہ مذہبی شناخت کا اندراج بھی ہونا چاہیے تاکہ شناختی کارڈ مکمل شناخت نامہ بن جائے۔

مذہبی شناخت کے اضافہ کا مطالبہ "عالمی مجلس تحفّظ ختمِ نبوّت" ایک عرصہ سے کرتی چلی آرہی تھی، لیکن گزشتہ ماہ پاکستان کی مؤثّر سیاسی و دینی جماعتوں نے متّحدہ طور پر اس بنیادی مطالبے کو تسلیم کرانے کے لیے پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے مظاہرہ کا پروگرام بنایا۔

حسنِ اتّفاق کہ مظاہرے کے لیے متعین وقت سے قبل ہی نواز شریف حکومت (جو اسلام کے نفاذ کے نعرہ پر منتخب ہوئی تھی۔) نے اسلامیان پاکستان کے اس دیرینہ مطالبہ کو تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا۔ جو واقعی ایک اچھا قدم تھا۔

حکومت کے اعلان کے بعد جہاں مُسلمانانِ پاکستان میں خوشی کی لہر دوڑی وہاں چند سیاسی راہنماؤں نے اس کو "شہریوں میں درجہ بندی کی سازش" "عوام کی تقسیم" اور غیر مُسلم راہنماؤں خصوصاً عیسائیوں کی طرف سے "غیر مسلم اقلیتّوں سے تعصب" اور دوسرے درجہ کے شہری بنانے" کی سازش کا عنوان دے کر مسترد کرنے کی کوشش کی۔

شناختی کارڈ سے متعلقہ اعلان پر مختلف حلقوں کی طرف سے تنقید کا جو طوفان بپا کیا گیا ہے اس کی بُنیاد چند خدشات پر ہے جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ شہریوں میں درجہ بندی کی سازش

۲۔ غیر مسلموں کو دوسرے درجہ کا شہری بنا کر امتیازی سلوک کرنا۔

۳ شہریوں کی تقسیم در تقسیم کا پروگرام

۴۔ غیر مسلموں سے انتقامی سلوک کا منصُوبہ

آیئے ہم درج بالا اعتراضات و اشکالات کا جائزہ لیتے ہیں کہ واقعی ایسا ہے؟

(۱) جہاں تک اس اعتراض کا تعلق ہے کہ شناختی کارڈ میں مذہب کے اندراج سے شہریوں میں درجہ بندی ہو گی تو اُس کی حقیقت واضح کرنے کے لیے ہم مذہب کے خانہ سے قبل موجودہ شناختی کارڈ (جس پر تا حال کوئی اعتراض نہیں ہے) کا جائزہ لیتے ہیں جس میں کارڈ کے نمبر کے بعد سب سے پہلا خانہ نام کا آتا ہے۔ اس

میں ہر شہری کا اپنا رکھا ہُوا نام درج ہوتا ہے۔

نام کے رکھنے میں نہ صرف ریاست اور اس کے ادارے کسی قسم کی مداخلت نہیں کرتے بلکہ اکثریت بھی کسی اقلیت کو کسی نام کے اختیار کرنے یا ترک کرنے پر مجبور نہیں کرتی۔ یہ خالصتاً اپنی پسند اور انتخاب کے زمرے میں آتا ہے جس کے لیے کم از کم پاکستان کا ہر شہری آزاد ہے۔ اب ملاحظہ فرمائیں کہ آپ کے پاس چند کارڈ آتے ہیں آپ ان کے پہلے خانے یعنی نام میں درج اسماء گرامی ملاحظہ فرمائیں۔

پہلا کارڈ ذوالفقار علی، دوسرا کارڈ معراج محمد، تیسرا کارڈ محمد حنیف، چوتھا کارڈ رانا چندر سنگھ، پانچواں کارڈ غلام مصطفےٰ، چھٹا کارڈ گھنشیام پرکاش، ساتواں کارڈ فتحیاب علی، آٹھواں کارڈ پیٹر جان سلہوترا، نواں کارڈ عبدالحفیظ اور دسواں کارڈ جے سالک۔ ایک قاری ان کارڈز پر لکھے ناموں میں اس قدر اختلاف دیکھ کر کچھ نہیں سمجھے گا؛ کیا یہ نام کچھ نہیں بتا رہے؟

اگر واقعی ذوالفقار علی، محمد حنیف اور رانا چندر سنگھ ایک چیز ہیں، گھنشیام پرکاش اور فتحیاب علی میں کوئی فرق نہیں جے سالک اور معراج محمد میں کوئی درجہ بندی نہیں، پیٹر جان سلہوترا اور غلام مصطفےٰ مترادفات میں سے ہیں تو بالکل درست ہے اور اگر ایسا نہیں ہے اور واقعی ایسا نہیں ہے تو پھر غیر مسلموں کو اپنے نام بھی بدل لینے چاہئیں تاکہ اُن کے نام ملک کی اکثریت کے مطابق ہو جائیں اور شہریوں کی درجہ بندی بھی ختم ہو جائے۔

معترضین کے مطابق تمام نام بھی ایک جیسے ہونے چاہییں تاکہ شہریوں میں کسی قسم کی کوئی درجہ بندی کی بُو محسوس نہ ہو، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ایسا ممکن ہے؟

ظاہر ہے کہ مسلمان عیسائیوں جیسے اور عیسائی ہندو جیسے اور سکھ یہودیوں جیسے نام پسند نہیں کرتے اور نام کے خانے میں از خود درجہ بندی کر لیتے ہیں تو مذہب کے خانے کے اضافے سے کونسی درجہ بندی ہو گئی۔

ایں چہ بوالعجبی ست

معترضین شاید اس بُنیادی حقیقت سے نابلد ہیں کہ مذہب ہر شخص کا امتیاز اور افتخار ہوتا ہے ایک مسلمان کے لیے اسلام، عیسائی کے لیے عیسائیت، ہندو کے لیے ہندومت اور یہودی کے لیے یہودیت باعث شرم نہیں بلکہ باعث اعزاز ہیں، کیونکہ مذہب ہر شخص رضاکارانہ اختیار کرتا ہے اور وہ اس کا نہ صرف اظہار کرنا پسند کرتا ہے بلکہ اس کے اخفا کو کتمان حق سے تعبیر کرتا ہے۔ اس حقیقت کے باوجود بھی

اگر کوئی کسی کے مذہبی شناخت کو درجہ بندی سے تعبیر کرتا ہے تو اس کی فہم و بصیرت کے لیے دُعائیں کی جاسکتی ہے۔

(۲) اب اس اعتراض کی حقیقت اور بُنیاد کا جائزہ لیتے ہیں کہ کیا اس عمل سے غیر مسلموں کو دوسرے درجے کا شہری بنا کر امتیازی سلوک کیا جاسکتا ہے ؟

معترضین نے شاید یہ سمجھا ہے کہ اگر شناختی کارڈ میں مذہب کے خانے کا اضافہ نہ کیا جائے تو شہریوں کے مذاہب کے بارے میں ریاست اس کے ادارے اور عوام بے خبر اور لاعلم رہ سکتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے کیونکہ شہریوں کی شناخت کے لیے واحد ذریعۂ معلوم محض شناختی کارڈ ہی نہیں ہے۔ پاسپورٹ، ملازمت کے فارم اور دیگر دستاویزات میں مذہب کا خانہ لازمی ہوتا ہے، جس پر تا حال کوئی اعتراض بھی وارد نہیں کیا گیا، لیکن اس کے باوجود معلوم ہوتے ہُوئے بھی کبھی غیر مسلموں سے امتیازی سلوک روا نہیں رکھا گیا بلکہ ان معنوں میں تو امتیاز کیا گیا کہ غیر مسلم اقلیتوں کو مسلم اکثریت کی لمبی قطار سے ہٹا کر دوسرے دروازے سے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں داخلے اور ملازمتیں دی جاتی ہیں جبکہ مُسلم اکثریت اہلیت و صلاحیت میں ان سے بدرجہا بہتر ہونے کے باوجود محض لمبی قطار کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے اور وہ نمبر آنے تک زائد از ضرورت قرار دے دیے جاتے ہیں۔

حالات و واقعات مسلم اور غیر مسلم کے تشخص کو غیر مسلموں کے مفاد میں ثابت کرتے ہیں، پاکستان میں آج تک غیر مُسلموں کی شناخت اُن کے لیے کوئی مسئلہ نہیں بنی بلکہ اُن کے فائدے کے سبب رہی ہے تو اب شناختی کارڈ میں مذہب کے اندراج سے یہ کیسے فرض کر لیا گیا کہ اچانک غیر مسلموں سے امتیازی سلوک شروع کر دیا جائے گا۔ یہ اعتراض بھی محض نقش بر آب کی حیثیت رکھتا ہے۔

(۳) شہریوں کے مزید تقسیم ہونے کا اعتراض بھی اپنے اندر کوئی استدلال نہیں رکھتا کیونکہ یہ اعتراض بھی محض اس مفروضہ اور خدشے کی بُنیاد پر کیا گیا ہے کہ جیسے ہی کارڈ میں مذہب کا خانہ شامل ہوگا تمام شہریوں میں مذہبی تقسیم ہو جائے گی جو کہ ملک کے شہریوں کی وحدت اور اخوت کے لیے سم قاتل کا درجہ رکھتی ہے۔

ابھی تک باقاعدہ مذہبی شناخت کے کارڈ جاری نہیں ہُوئے تو کیا معترضین کے مطابق فی الوقت ملک میں کسی قسم کی کوئی تقسیم نہیں ہے ؟ تمام شہری یک جان و متّحد ہیں ؟ تمام شہری یکساں کوائف کے حامل ہیں، ان میں اس ضمن میں کوئی تفاوت و تقسیم نہیں ہے ؟ اس سوال کا جواب معترضین بھی

اثبات میں نہیں دے سکتے۔

یہ اعتراض تو اس وقت بجا ہوتا کہ ملک کے تمام شہری ہر معاملے میں یکساں ہوتے جبکہ واقعات اس کے برعکس شاہد ہیں۔ علاقائی اختلافات کو عصر حاضر میں دینی اختلاف سے زیادہ اہمیت دی جارہی ہے اور وطن عزیز میں گزشتہ سالوں میں منعقد ہونے والے سیاسی حالات و واقعات اس کا مُنہ بولتا ثبوت ہیں، لیکن کسی نے یہ اعتراض نہیں فرمایا کہ علاقائی اختلاف ملکی سالمیت اور وحدت کے لیے سنگین خطرہ کا درجہ رکھتا ہے اس لیے شناختی کارڈ سے ایڈریس کا خانہ ختم کر دینا چاہیے تاکہ علاقائی نفرت کا خاتمہ ہو سکے، کیونکہ علاقائی امتیاز کے عفریت نے ملّی اخوت و یگانگت اور ملکی سلامتی و وحدت کو نگل لیا ہے اور اس بہادر قوم کو ٹکڑوں تقسیم در تقسیم کی پھینٹ چڑھا دیا ہے اور ستم یہ کہ اسلام میں علاقائی وابستگی کوئی اعزاز نہیں، اس کے باوجود کوئی بھی "ذی ہوش" اور "فرزانہ" اس کا مدعی نہیں کہ ایڈریس کا خاتمہ کر دینا چاہیے جبکہ مذہب سے وابستگی پر ہر شخص اپنا اعزاز سمجھتا ہے اور کسی بھی مذہب کا پیرو اپنے مذہب پر پشیمان نہیں ہوتا (ظاہر ہے کہ اگر وہ پشیمان ہو تو اس کو ترک کر دے گا) مذہب کے لیے تو انسان اپنی جان کی بازی لگانا بھی باعثِ سعادت سمجھتا ہے تو اس اعزاز اور افتخار کا اظہار اور اعلان جو ہر شخص کی فطرت ہے کیسے تقسیم کا باعث بن جائے گا؟ کوئی عیسائی اپنے آپ کو ہندو کہلوانا پسند نہیں کرتا اسی طرح کوئی ہندو بھی خود کو عیسائی کہلوانا نہیں چاہتا۔ ایک سکھ خود کو سکھ ہی کہلوانا اپنا فخر سمجھتا ہے اور یہودی بھی اپنا مذہب تبدیل کرنے کو اچھا نہیں سمجھتے۔ اس طرح اگر مسلمان بھی خود کو مسلمان کہلوانا پسند کرتے ہیں اور دوسرے تمام اہل مذاہب کو بھی یہ حق دیتے ہیں تو اس پر وہ کیونکر گردن زدنی قرار دیے جا سکتے ہیں؟ ہر شخص کی حسبِ منشا اس کے پسندیدہ مذہب سے وابستگی کا اظہار ہو تو اس کو کن دلائل کی بُنیاد پر تقسیم کا عمل قرار دیا جا سکتا ہے؟ شہریوں کی مذہب سے وابستگی رضا کارانہ ہوتی ہے جبری نہیں۔ ایک رضا کارانہ اور فدا کارانہ جذبہ کو قانُونی شکل دینا دُنیا کی کسی لغت میں تقسیم کے مترادف نہیں ہے۔

(۴) "غیر مسلموں سے انتقامی سلوک" کم از کم مسلمانوں کے ہاں روا نہیں رکھا جاتا۔ اسلام میں اس کی قطعاً گنجائش نہیں ہے بلکہ اسلامی تاریخ اس کے علی الرغم واقعات سے لبریز ہے۔

اسلام میں غیر مسلموں، ذمیوں کے حقوق بالصراحت اور بالالتزام بیان کیے گئے ہیں۔ اسلام کی

چودہ سو سالہ تاریخ اس باب میں اس قدر مالا مال ہے کہ دوسرا کوئی مذہب اس کی نظیر پیش کرنے سے تاحال قاصر ہے۔

زیادہ دُور نہ جائیے اور صرف ماضی قریب کو دیکھیں تو بھی قیام پاکستان کے بعد سے تا امروز ایک سرسری مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ پاکستان میں کبھی بھی اس قسم کا واقعہ رونما نہیں ہُوا کہ کسی شخص کو محض اس کے مذہب کے بناء پر انتقامی کاروائی کا نشانہ بنایا گیا ہو۔ مقامی ذاتی رنجشوں کی بناء پر ناگفتنی صورتِ حال کو مذہبی رنگ دینا ایک الگ بات ہے لیکن کہیں کوئی اس بُنیاد پر کوئی قابلِ ذکر واقعہ رونما نہیں ہُوا۔

بھارت میں آئے دن ہونے والے مُسلم کش فسادات کوئی ڈھکی چھُپی بات نہیں یہ روزِ روشن کی طرح عیاں اور بیاں ہے۔ انتہا پسند متعصب ہندو تنظیموں اور ان کے سرپرست انتظامیہ کی طرف سے مُسلمانوں پر آئے روز جو قیامتیں ڈھائی جاتی ہیں۔ وہ کوئی راز نہیں ہیں۔

اس کی تازہ ترین مثال کشمیر کے شب و روز ہیں، جہاں بھارتی فوجیوں نے مظالم کے تمام ریکارڈ توڑ دیے ہیں۔ مسلمان عوام خصوصاً عورتوں اور بچّوں پر ایسے انسانیت سوز مظالم ڈھائے جا رہے ہیں کہ انسانیت حیوانیت سے مُنہ چھپائے پھر رہی ہے لیکن اس تمام تر صورتِ حال پر اقوامِ عالم خاموش تماشائی کا کردار ادا کر رہی ہیں۔ محض اس لیے کہ کشمیری، ہندو، عیسائی یا یہودی نہیں بلکہ مسلمان ہیں۔

دوسری طرف ملاحظہ فرمائیں کہ سربیا کے متعصب عیسائیوں نے بوسنیا اور کروشیا کی مسلمان آبادی پر تاریخ ساز مظالم کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ جہاں تک کہ مُسلمانوں کو اپنے شہداء کو دفنانے کی بھی مہلت نہیں دی جا رہی اور اُن کی امداد کے لیے اطرافِ عالم سے حصار قائم کیا ہُوا ہے، لیکن اقوامِ متّحدہ کا عیسائی سیکرٹری جنرل اور دُنیا کی متمدن اور مہذب مملکتیں جو عیسائی مذہب سے تعلق رکھتی ہیں تمام تر جور و ستم پر آنکھیں بند کیے بیٹھی ہیں۔

مسلمانوں کے دل اس کربناک صورتِ حال پر جس قدر مضطرب ہیں وہ محتاجِ بیاں نہیں ان حالات میں اسلامیانِ پاکستان میں ہندو اور عیسائی اقلیّت کے خلاف اشتعال ایک بُنیادی اور فطری امر ہے لیکن بحمداللہ آج تک کسی ہندو اور عیسائی کو ایک سوئی تک نہیں چُبھی۔

آج بھی پاکستان میں ہندو اور عیسائی اقلیتیں حسبِ معمول خوش و خرم زندگی گزار رہے ہیں۔ یہاں تک کہ حکومتِ پاکستان کی وزارت میں بھی شامل ہیں۔

ستم بالائے ستم یہ کہ وہ محض خدشات اور واہموں کی بُنیاد پر ایک موقف قائم کرتے ہُوئے حکومتِ پاکستان کے خلاف نہ صرف پاکستان کے شہروں میں مظاہرے کر رہے ہیں بلکہ بیرونی ممالک میں بھی پاکستان کی رسوائی کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کر رہے۔

ایسا بھی نہیں ہے کہ مسلمانانِ پاکستان کو ہندوؤں اور عیسائیوں کے بارے میں کماحقہٗ معلومات نہیں ہیں اور جب تک شناختی کارڈ میں اُن کے مذاہب کا اندراج نہیں ہوگا۔ وہ بے خبر رہیں گے بلکہ ہر علاقے شہر اور گاؤں کے شہری ایک دوسرے کے بارے میں بخوبی جانتے ہیں۔

تمام تر معلومات و آگہی کے باوجود اگر مُسلمان انتہائی تحمّل اور بردباری کے ساتھ باہمی اخوت کا دامن چاک نہیں کر رہے تو محض اس لیے کہ ان کے دین کی تعلیمات کا یہی تقاضا ہے اور ان کی یہی تاریخ ہے۔

ان تمام تر حقائق کے باوجود یہ خیال کرنا کہ شناختی کارڈ میں مذہب کے خانے کے اضافے کے ساتھ ہی تمام شہری ایک دوسرے کو پہچان لیں گے۔ اور ایک دم تشدّد اور تعصب کا لاوا پھٹ جائے گا، ایسا ہی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ سورج سے تاریکی، چاند سے ظلمت اور پھُولوں سے بدبُو پھیل رہی ہے۔ خدا جانے یہ معترضین کا تجاہلِ عارفانہ ہے یا تعارفِ جاہلانہ؟

بہرحال اُن کی ذہنی وسعت اور اندازِ استدلال پر سوائے ہمدردی اور دُعا کے کیا کیا جا سکتا ہے؟

پردۂ زنگاری کا معشوق

جیسا کہ ہم نے معترضین کے ایک ایک خدشے اور واہمے کا واقعاتی اور استدلالی تجزیہ پیش کیا ہے جس سے یہ بات اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ اگر غیر مُسلم اقلیتوں کو شناختی کارڈ میں مذہب کے اندراج سے فی الواقع یہ خطرات لاحق ہونے کا اندیشہ ہے تو بھی یہ محض اندیشہ اور واہمہ ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور محض اندیشوں اور واہموں کی بُنیاد پر مظاہرے اور بھُوک ہڑتالیں نہیں کی جاتیں بلکہ حکومت سے باقاعدہ مذاکرات کے ذریعہ اپنے مفادات کا تحفّظ اور وساوس و خدشات کا تدارک کیا جاتا ہے۔ آج تک اقلیتوں کا یہی طریقِ کار رہا ہے۔

قابلِ غور یہ بات ہے کہ اس سلسلے میں سب سے زیادہ شور عیسائی اقلیت کی طرف سے مچایا گیا ہے اور کسی حد تک ہندو برادری نے بھی اُن کی ہاں میں ہاں ملائی ہے جبکہ پاکستان کے گزشتہ واقعات کا ایک

ایک لمحہ اس بات پر شاہد عادل ہے کہ مذکورہ بالا دونوں اقلیتی ۱۹۴۷ء سے ۱۹۹۲ء تک سب سے زیادہ فائدے میں رہی ہیں۔

۱۹۴۷ء ہی میں پاکستان کی حکومت کی ساخت پر نظر ڈالیں تو صاف پتہ چلتا ہے کہ اس کی پہلی کابینہ میں وزارتِ داخلہ کے قلمدان پر ایک ہندو وزیر براجمان تھے۔ وزارتِ خارجہ ایک قادیانی نے سنبھالی ہوئی تھی۔ قانون کی اعلیٰ مسند پر ایک عیسائی جلوہ افروز تھے اور آج بھی دیکھیں تو مرکزی کابینہ میں رانا چندر سنگھ اور پیٹر جان سلھوترا اپنی آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہیں، جبکہ پارلیمنٹ میں ایک عیسائی رکن جے سالک نے الگ "رونق" لگائی ہوئی ہے جداگانہ انتخاب کی بناء پر پارلیمنٹ میں ان کی مستقل نشستیں موجود ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب عیسائی اور ہندو اقلیت کو پاکستان میں کوئی تکلیف ہے اور نہ اُس کا احتمال تو پھر یہ شور کیسا؟ اس پردۂ زنگاری میں یقیناً کوئی معشوق چھپا ہے؟

جیسا کہ ہم نے عرض کیا تھا کہ ۱۹۷۴ء سے پاکستان کی پارلیمنٹ نے آئین میں متفقہ ترمیم کے ذریعہ منکرینِ ختمِ نبوّت (قادیانی اور قادیانی لاہوری) کو غیر مُسلم اقلیت قرار دیا تھا۔ اس وقت سے تادم تحریر قادیانی پاکستان کی سالمیت اور وحدت کے پہلے سے زیادہ درپے ہو گئے ہیں کیونکہ وہ اس سے قبل تو پاکستان کو قادیانی اسٹیٹ بنانے کے مشن پر کارفرما تھے، لیکن جب اُنہوں نے اپنے منصوبہ کو خاک میں ملتے دیکھا تو وہ زخمی ناگ کی طرح ہمہ وقت پاکستان اور مُسلمانوں کے دَرپے آزاد ہو گئے۔

قادیانیوں نے اگرچہ اب اپنا مرکز ربوہ سے لندن منتقل کر لیا ہے اور تمام تر سازشوں کی آماجگاہ قادیانی مرکز ہے، یہی مرکز یہودیت کے تعاون سے پاکستان کے خلاف بیرونی ملک بھی مختلف مظاہروں کے پروگرام ترتیب دیتا ہے اور اندرونِ ملک بھی اپنے کاسہ لیسوں اور نمک خواروں کے طفیل پاکستان کے سیاسی اور انتظامی معاملات میں دخیل رہنے کی سعیٔ ناتمام کرتا رہتا ہے۔

اس فتنہ پرداز گروہ کی ہر لمحہ یہی کوشش اور خواہش رہتی ہے کہ کسی طرح پاکستان میں جمہوری حکومت کا خاتمہ ہو جائے اور کوئی ایسا آمر مطلق مسلّط ہو جائے جو ۱۹۷۳ء کے دستور کو ختم کرنے کا اعلان کر کے ان کو حیاتِ نو بخش دے مگر۔ اے بسا آرزو کے خاک شُدہ۔

دراصل شناختی کارڈ میں مذہب کے خانہ کے اضافہ کی زد بھی قادیانی ٹولہ نے محسوس کی ہے کیونکہ یہ نہ

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

اسراء و معراج

(نقلی اور عقلی بحث)

اسراء و معراج کا فرق

حضور علیہ السلام کے ایک مخصوص سفر و سیر کا نام اسرا و معراج ہے اس سفر کا پہلا زمینی حصہ جو مکہ معظمہ سے بیت المقدس تک ہے اس کا نام اسرا ہے اور مسجدِ اقصیٰ سے عالم بالا کی آخری منزل تک کے سفر کا نام معراج ہے۔ پہلا حصہ سورۂ بنی اسرائیل کے اوّل میں اور دوسرا حصہ معراج کا سورۂ نجم کے اوّل میں مذکور ہے۔ اس واقعہ کی تفصیلات احادیث میں مذکور ہیں۔ زرقانی نے مواہب لدنیہ میں لکھا ہے کہ واقعہ معراج کو ۴۵ صحابہ نے حضور علیہ السلام سے نقل کیا ہے۔

آراء مختلفہ دربارۂ معراج

اس واقعہ میں مندرجہ ذیل امور میں اختلاف رائے موجود ہے (۱) معراج کا آغاز کس مکان سے ہوا۔ (۲) یہ واقعہ کس تاریخ کو پیش آیا۔ (۳) اس واقعہ کی کیفیت کیا تھی۔ روحانی یا جسمانی، منامی یا اتقاظی (۴) اس سفر کی آخری حد کہاں تک تھی۔

آغاز معراج

قرآن حکیم کا بیان یہ ہے کہ سفرِ معراج مسجد الحرام سے شروع ہوا۔ سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ۔ وہ خدا ہر نقص سے پاک ہے جو رات کو لے گیا اپنے خاص بندے کو مسجد الحرام سے مسجدِ اقصیٰ تک، صحیحین میں انس بن مالک نے مالک بن صعصعہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ آغاز سفر حطیم اور حجر سے ہوا۔ حطیم اور حجر چونکہ ایک ہی چیز ہے اور یہ مسجد الحرام میں واقع ہے، لہٰذا یہ روایت قرآن کے خلاف نہیں، نسائی میں ابن عباس کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ معراج کا آغاز اُم ہانی کے گھر سے ہوا۔ بخاری شریف میں ابوذر کی روایت ہے۔ فرج سقف بیتی و انا بمکہ کہ میرے گھر کی چھت پھٹ گئی اور میں مکہ میں تھا، جس سے معلوم ہوتا کہ خود حضور کے گھر سے اس سفر کا آغاز ہوا، واقدی کی روایت میں ہے کہ یہ سفر شعب ابی طالب سے

شروع ہُوا۔ یعنی اس درّہ میں جس میں ابوطالب کا گھر تھا اور چونکہ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم اس گھر میں سکونت رکھتے تھے تو بہ لحاظ سکونت سفر کا آغاز حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مسکن یعنی گھر سے ہوا۔ اور باقاعدہ سفر مسجد حرام سے شروع ہُوا۔ اور مسجد حرام میں بالخصوص اس جگہ سے جو حجر و حطیم کہلاتا ہے۔

تعیّن سال زمان سفر معراج

یہ سفر کس سال پیش آیا۔ مختار قول یہ ہے کہ معراج کا واقعہ ہجرت سے ایک سال پہلے پیش آیا۔ یعنی نبوت کے بارہویں سال نووی نے فتاوی میں اس کو مختار کہا۔ اور ابن حزم نے اس پہ اجماع نقل کیا ہے۔

تعیّن ماہ

معراج کس مہینے میں ہُوئی۔ اس میں اگرچہ ربیع الاوّل۔ ربیع الاخر۔ رمضان اور شوال کے اقوال بھی موجود ہیں، لیکن امام نووی نے کتاب الروضہ میں ماہ رجب کو ترجیح دی ہے۔ رجب میں ۲۷، رجب کی تاریخ کو ابن عبدالبر نووی عبدالغنی المقدسی نے ترجیح دی ہے۔

تعیّن رات

اگرچہ اس میں سنیچر اور جمعہ کی شب کی روایت ضعیفہ بھی مذکور ہے، لیکن مختار قول یہ ہے کہ معراج کا واقعہ پیر کی رات کو پیش آیا۔ ابن اثیر اور ابن منیرؒ نے اسی کو مختار کہا ہے۔

کیفیّت سفر معراج

یہ سفر جسم و روح دونوں کے ساتھ بیداری میں ہُوا۔ یہی قول جمہور اہلِ اسلام علماء۔ محققین۔ صحابہ اور تابعین کا ہے۔ اس کے برخلاف بعض اہلِ الحاد نے اس کو خواب یا روحانی واقعہ قرار دیا ہے اور اس کا حضرت عائشہ رضؓ اور حسن بصری کی طرف انتساب کسی صحیح روایت سے ثابت نہیں، البتہ حضرت عائشہ رضؓ اور حضرت معاویہ رضؓ کی روایت صحاح ستہ میں نہیں ہے۔ سیرۃ ابن اسحاق میں مذکور ہے۔ دونوں کے متعلق صحیح رائے یہ ہے کہ ثابت نہیں ہیں حضرت عائشہ کی روایت کے متعلق روح المعانی میں مذکور ہے "لعلہ لم یصح عنہا کما فی البحر" شاید یہ روایت درست نہیں جیسے کہ تفسیر بحر المحیط میں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ حضرت عائشہ رضؓ سے روایت کی سند ان الفاظ میں مذکور ہے۔ "حدثنی بعض ال ابی بکر" یہ روایت مجھ کو ابوبکر کے خاندان والوں میں سے کسی سے پہنچی ہے۔ وہ شخص جو ابوبکر رضؓ کے خاندان سے تھا مذکور نہیں۔ تاکہ اس کو جانچا جائے۔ راوی نے یہ روایت خود حضرت عائشہ رضؓ سے نہیں سُنی۔ لہٰذا اصول حدیث کے قواعد کے تحت یہ روایت منقطع۔ مجہول اور مردود ہے۔

حضرت معاویہ کی روایت، حضرت معاویہ کی روایت کی سند سیرۃ ابن اسحاق عن یعقوب

بن عقبہ بن المغیرہ بن الاخنس۔ یعنی امیر معاویہ سے روایت کرنے والا راوی یعقوب بن عقبہ ہے جس کی امیر معاویہ سے نہ ملاقات ہے اور نہ ہی اس نے اس کا زمانہ پایا۔ ائمہ رجال نے لکھا ہے ھولم یدرک زمن معاویہ اس راوی نے حضرت معاویہ کا زمانہ نہیں پایا۔ لہٰذا یہ روایت منقطع مجہول اور مردود ہوئی۔ اس لیے نہ حضرت عائشہ سے یہ ثابت ہے کہ یہ واقعہ خواب کا ہے اور نہ حضرت معاویہ سے۔ لہٰذا ان حضرات کی طرف سے بیداری میں معراج کے سفر کا انکار غلط ہے۔

درایت

درایت اور عقل کے لحاظ سے بھی حضرت معاویہ کے واقعہ معراج کی بیداری کا انکار غلط ہے۔ واقعہ معراج بالاتفاق ہجرت سے قبل کا ہے اور کم از کم ایک سال ہجرت سے پیشتر کا ہے۔ اس وقت حضرت عائشہ صغیرۃ السّن اور بچّی تھیں اور حضورؐ کی زوجیت میں داخل نہیں ہوئی تھیں حضرت معاویہ واقعہ معراج کے وقت مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے۔ بلکہ واقعہ معراج سے آٹھ نو سال بعد مشرف بہ اسلام ہوئے۔ لہٰذا واقعہ معراج میں اُن صحابہؓ کرام کی روایت ہی صحیح ہے۔ جو اس واقعہ کے وقت بڑی عمر کے تھے اور مشرف بہ اسلام تھے اور خود حضور علیہ السلام سے جو کہ صاحبِ واقعہ تھے۔ اُنہوں نے واقعہ کی حقیقت سُنی تھی۔ وہ سب روایات صاف دلالت کرتی ہیں کہ یہ واقعہ بیداری اور جسمانی شکل میں پیش آیا۔ نیز روایتِ باری کے متعلّق حضرت عائشہؓ کا انکار اور استدلال بھی جو صحیحین میں مذکور ہے۔ اس امر کی دلیل ہے کہ حضرت عائشہؓ اس سفر کے بیداری اور جسمانی صورت میں ہونے کی قائل تھیں۔ صرف آنکھ کے ذریعہ اللہ کو دیکھنے میں متردّد تھیں۔ ورنہ خواب میں خدا کے دیکھنے کا کون انکار کر سکتا ہے۔

اہل الحاد کے استدلال رویا وغیرہ پر بحث

حدیث شریک "انا بین النائم والیقظان" یا روایت "فاستیقظ" کہ میں نیند اور بیداری کی حالت میں تھا یا یہ کہ پھر حضورؐ جاگے۔ اس کا جواب اوّلاً یہ ہے کہ شریک راوی کثیر الغلط ہے اور محدثین نے اس روایت میں اس کی غلطی کی تصریح کی ہے کہ اس نے اپنے بیان میں بے ترتیبی کی ہے۔ دوم یہ کہ امام قرطبی نے اسی حالت کو ابتدا پر محمول کیا ہے کہ جب سفرِ معراج کے لیے تشریف لے جانے لگے تو آپ نیند اور بیداری کی درمیانی حالت میں تھے پھر بیدار ہوئے یا محدثین کے نزدیک انتہاء سفر پر محمول ہے۔ جب حضور علیہ السلام نے سفر معراج طے کیا اور واپس مسجد حرام تشریف لائے تو تھکان کی وجہ سے سو گئے،

پھر بیدار ہوئے۔ اس تطبیق کی ضرورت اِس لیے پیش آئی کہ عام مشہور روایات جو اس سفر کی بحالت بیداری جسمانی طور پر ہونے پر دال ہیں۔ یہ روایت اُن کے مطابق ہو جائے۔ ورنہ شریک راوی کی روایت کو غلطی پر محمول کرنا پڑے گا کہ اس نے ابتداء سفر یا انتہاء سفر کی حالت کو درمیانی واقعہ میں بیان کیا ہے۔

اسی طرح قرآنِ پاک کی آیت وما جعلنا الرؤیا التی اریناک الا فتنۃ للناس والشجرۃ الملعونۃ فی القرآن کہ ہم نے نہیں کیا اس دکھاوے کو جو آپ نے دیکھا اور برا درخت مگر لوگوں کے ایمان کے لیے۔ اہلِ زیغ اور الحاد نے جس طرح شریک کی مخلوط روایت سے استدلال کیا۔ اسی طرح اس آیت سے بھی استدلال کیا کہ قصۂ معراج منامی واقعہ ہے کیونکہ معراج کے واقعہ کے لیے آیت مذکور میں لفظ رویا استعمال کیا گیا ہے۔ وہ خواب کے معنی میں ہے۔ یہ استدلال بھی غلط ہے۔ اس وجہ سے کہ یہ لفظ دکھاوے کے معنی میں عربی زبان میں استعمال ہوتا ہے۔ خواہ خواب میں دیکھنا ہو یا بیداری میں ہو۔ امام لغت صاحب قاموس نے تصریح کی ہے کہ لفظ رویا جسم کی آنکھ سے دیکھنے کے معنی میں آتا ہے۔ نیز شعرائے قدیم میں سے راعی نے رویا کو آنکھ سے دیکھنے کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ وہ شکاری کی تعریف کر کے لکھتا ہے ؎

وکبر للرؤیا وھش فؤادہٗ وبشر قلبا کان جمّا بلا بلہٗ

شکاری نے شکار کو دیکھ کر اللہ اکبر کہا اور اس کا دل خوش ہُوا اور ایسے دل کو خوشخبری سُنائی، جس کی پریشانیاں بہت تھیں۔ اِس شعر میں جسمانی طور پر دیکھنے کے لیے لفظ رویا کو استعمال کیا گیا ہے۔ متنبی شاعر نے بھی اسی معنی میں رویا کو استعمال کیا ہے۔ وہ اپنے ممدوح بدر بن عمار کی تعریف میں کہتے ہیں ؎

مضی اللیل والفضل الذی لک لا یمضی ورؤیاک اعلی فی العیون من الغمض

رات ختم ہُوئی اور تیری خُوبی ختم نہیں ہوتی۔ تیرا دیکھنا آنکھوں میں نیند سے زیادہ شیریں ہے۔ یہاں لفظ رویا بیداری کی حالت میں استعمال ہُوا۔ ان دلائل سے قطع نظر اگر لفظ رویا خواب اور بیداری دونوں حالتوں کے دیکھنے کے لیے مشترک ہے تو خود قرآن نے اس کے بیداری کی حالت میں دیکھنے کے معنی متعیّن کر دیے کہ قرآن نے اس دکھاوے کو جو حضور علیہ السلام نے معراج میں دیکھا۔ فتنۃ للناس کہہ کر امتحان ایمان قرار دیا اور بموجب روایات اہلِ مکہ نے امتحاناً حضورؐ سے بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ کے احوال دریافت کیے اگر یہ خواب کا واقعہ ہوتا تو اس میں نہ فتنہ تھا نہ ایمان کا امتحان اور نہ دریافت کی ضرورت۔ خواب میں تو اس سے بڑے واقعات بھی قابل تعجب نہیں ہوتے۔ معلوم ہُوا کہ واقعہ بیداری کا تھا۔

قرآن سے جسمانی معراج کا ثبوت

قرآن حکیم نے سورۃ بنی اسرائیل میں واقعہ معراج کو اس انداز میں بیان کیا ہے جس سے معراج کا جسمانی ہونا خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ابتداء سفر سے لے کر انتہاء سفر تک آپؐ کی ایک جیسی حالت تھی۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس واقعہ کا کچھ حصّہ جسمانی طور پر بیداری میں ہو اور کچھ رُوحانی ہو اور خواب ہو۔ سورۃ بنی اسرائیل کی آیت یہ ہے: سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ الذی بارکنا حولہٗ لنریہ من اٰیاتنا ... الخ اس قرآنی ارشاد میں جسمانی معراج کے وجوہات حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ واقعہ کا آغاز لفظ سبحان سے ہُوا ہے جو تعجب کے لیے اور اظہارِ قدرت کے لیے استعمال ہوتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ معراج تعجب انگیز بھی ہے اور ظہورِ قدرتِ خداوندی کی نشانی بھی ہے اور یہ اس صورت میں ممکن ہے کہ واقعہ معراج جسمانی ہو۔ خواب نہ ہو۔ کیونکہ خواب کیسا بھی ہو۔ اس میں اللہ کے اعتبار سے نہ تعجّب انگیزی ہے اور نہ اس عظیم قدرت کا ظہور

۲۔ بعبدہ کے لفظ میں ظاہر کیا گیا کہ اس واقعہ کا تعلّق جسم اور رُوح دونوں سے ہے کیونکہ عبد رُوح وجسد دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔ نہ صرف رُوح کا۔ ورنہ خدا یُوں فرماتا اسری بروحہٖ لفظ عبدہٖ عبادت سے ہے اور عبادت جسم اور رُوح کے مجموعے سے متعلق ہے جیسے سورۃ جن میں حضور علیہ السلام کے بارے میں آیا ہے: وانہٗ لما قام عبداللہ یا سورۃ اقراء میں ارأیت الذی ینھی عبداً اذا صلّی عبد سے حضور علیہ السلام کا مجموعہ روح وجسد مراد ہے۔ اسی طرح قرآن میں جہاں کہیں لفظ عبد آیا ہے۔ روح وجسم کے مجموعے کے لیے استعمال ہُوا ہے تو واقعہ معراج میں بھی وہی معنی مراد ہیں۔

۳۔ تیسری وجہ لفظ اسراء ہے۔ جو قرآن اور لغتِ عرب میں رُوح اور جسم کے مجموعے کو رات کے وقت لے جانے کا نام ہے۔ جیسے حضرت لوط علیہ السلام کو قرآن میں ارشاد ہے۔ "فاسر باھلک"۔ آپ اپنے اہل کو رات کے وقت لے چلو۔ نہ یہ کہ اُن کی رُوح کو لے چلو۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خدا کا حکم ہُوا۔ "ان اسر بعبادی لیلاً انکم متبعون"۔ اے موسیٰؑ میرے بندوں کو رات کے وقت لے چلو۔ یقیناً تمہارا تعاقب کیا جائے گا۔ ان دونوں آیتوں میں وہی لفظ آیا ہے جو واقعہ معراج کے بیان میں آیا ہے۔ یعنی اسراء کا لفظ۔ لیکن دونوں جگہ جسمانی سیر مراد ہے نہ کہ خواب یا رُوحانی سیر اسی طرح واقعہ معراج کو بھی سمجھنا چاہیے۔

واقعہ معراج پر عقلی بحث

اس واقعہ پر عقلاً چند شبہات پیش کیے جا سکتے ہیں۔

۱۔ کہ اس واقعے کا مقصد اگر خدا کو دیکھنا تھا تو یہ اس سفر کے بغیر بھی ممکن تھا۔ سفر کرانے کی کیا ضرورت تھی۔ جواب اوّلاً یہ ہے کہ قرآن نے مقصد سفر بیان کیا ہے "لنریہٗ من ایاتنا" کہ اس سفر کا مقصد عالم بالا کی اشیاء کا دکھانا تھا۔ جن کے دیکھنے سے اللہ کی عظیم قدرت کا ظہور ہوتا ہے۔ مثلاً عرش قلم لوح محفوظ۔ سدرۃ المنتہیٰ جنت وغیرہ۔

۲۔ دوم یہ ہے کہ عالمِ بالا جو گناہوں سے پاک ہے اور عجائباتِ قدرت کا محل ہے۔ وہاں لے جانے میں خاتم الانبیا علیہم السّلام کے اعزاز و اکرام کا ظہور ہے۔

دوسرا شبہہ یہ ہے کہ اس سفر میں حرو قر یعنی گرمی اور سردی سے حفاظت کا کیا انتظام تھا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ذلیل انسان نے جب ایئر کنڈیشن کے ذریعے گرمی سردی کا انتظام کیا ہے تو قادرِ مطلق اور خالق کائنات کے لیے یہ کیوں ناممکن ہے۔ جس کے ارادے کے آگے تمام قوانین طَبعِیّہ زیر فرمان اور مسخّر ہیں۔ محقّقینِ یورپ نے تصریح کی ہے کہ جس ذات نے قوانین طَبعِیّہ بنائے ہیں۔ اُن میں اس کو مداخلت اور تبدیلی کا بھی حق حاصل ہے۔ ہم نے ان کے مکمل حوالہ جات دوسری تصنیفات میں لکھے ہیں اور کسی قدر میری کتاب علوم قرآن میں بھی موجود ہیں۔

تیسرا شبہہ یہ ہے کہ ایسا طویل سفر تھوڑے وقت میں کیونکر ممکن ہو سکتا ہے؟ اس شُبہے کے جوابات حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ فلاسفہ قدیم و جدید اس امر پر متفق ہیں کہ حرکت کی تیزی اور سرعت کے لیے عقلاً کوئی حد مقرّر نہیں کی جا سکتی۔

جس زمانے میں جس قدر حرکت ممکن ہو اس زمانے کے کروڑویں حصّے میں بھی وہ حرکت ممکن ہے۔ اس بنا پر سرعتِ حرکت معراجیہ پر شبہہ کرنا اور اس کو ناممکن قرار دینا دونو فلسفوں کے خلاف ہے، البتہ مشاہدہ میں ایسی تیز حرکت نہ آنے کی وجہ سے یہ سفر تعجب انگیز ضرور ہے جیسے جدید تیز رفتار میزائل قبل از مشاہدہ پہلے زمانے میں محل تعجّب تھے لیکن اب نہیں۔

۲۔ اس سفر میں جو سواری استعمال ہوئی ہے اُس کو براق کہا جاتا ہے اور برق اور بجلی کی تیز رفتاری ضرب المثل ہے۔ پھر براقیت کے بھی مختلف درجات ہیں۔ اگرچہ عالمِ سفلی کی بجلی ہو، لیکن اگر یہ براقیت عالمِ علوی کی ہو۔

جن کی قوت ماوراء العقل ہے تو اس کی سرعت بے نظیر ہو گی۔ بالخصوص جبکہ حدیث کے مطابق حدِ نگاہ کی دُوری اس کے لیے ایک قدم تھا۔

۳۔ اس سواری کا اوّلاً شوخی کرنا اور پھر جبرائیلؑ کے بتلانے پر شرم وحیا کی وجہ سے پسینہ پسینہ ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ یہ سواری صاحبِ عقل تھی۔ اگرچہ عقل کو خدا ہر چیز میں پیدا کر سکتا ہے۔ بلکہ ہر چیز میں کسی قدر ہے جیسے کلٌ قد علم صلاتہٗ و تسبیحہٗ کائنات کی ہر چیز اپنی دُعا و تسبیح کو جانتی ہے، سے معلوم ہوتا ہے لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ ملکی قوّت کو اس سواری کی شکل میں متجسّد کر دیا گیا ہو اور یہ سواری ملکی قوّت کا مجسّمہ ہو اور ملائکہ کے لیے یہ مسافت طے کرنا ایک لمحہ کا کام ہے۔

۴۔ شاہ ولی اللہ اور دیگر محققین صوفیہ کے بیان کے مطابق جسم پر بعض اوقات رُوح کے احکام غالب آتے ہیں۔ جبکہ رُوح زیادہ پاک اور لطیف ہو۔ ایسی صُورت میں جسم اپنا ثقل چھوڑ کر تابع رُوح بن جاتا ہے خود اس احقر کے ایک فاضل متقی مرید مولوی بشیر احمد فیصل آبادی کو دورانِ ذکر یہ حالت پیش آئی۔ یہاں تک کہ بدن کا ثقل اور دباؤ ختم ہو گیا اور وہ چارپائی جو پہلے بیٹھنے سے دبتی تھی۔ اس حالت کے بعد چارپائی نہیں دبتی تھی۔ اس مضمون کو صدر شیرازی نے اسفارِ اربعہ میں مدلّل بیان کیا ہے تو حضور علیہ السلام کی رُوح جو افضل الارواح ہے۔ اس کے بھی احکام بدنِ حضور علیہ السلام پر غالب آگئے اور جس طرح روح کے لیے ملائکہ کی طرح تھوڑے وقت میں عالمِ بالا کو پہنچنا آسان ہے۔ حضور علیہ السّلام کے لیے بھی واقعہ معراج میں ایسا ہُوا اور گویا سواری کا ہونا اس صُورت میں فقط اعزاز کے لیے تھا۔

۵۔ قدیم فلسفہ میں پتّھر کا اُوپر سے زمین پر جلد پہنچنا میلانِ مرکز کا نتیجہ ہے اور جدید فلسفہ میں کششِ زمین کا نتیجہ ہے۔ تو یہ بھی ممکن ہے کہ واقعہ معراج میں رُوحِ محمدیؐ کو بوجہ کششِ عرش یا کششِ الٰہی کے دفعتہً عالمِ بالا میں پہنچنے کی نوبت آئی ہو اور سواری صرف اعزاز و اکرام کے لیے ہو یا دونوں چیزوں کو دخل ہو۔

۶۔ احادیثِ صحیحہ میں روانگیٔ معراج سے قبل حضور علیہ السّلام کا شقِ صدر کیا گیا اور سینہ آپ کا چیر کر اس میں عالمِ علوی کی کوئی چیز ڈال دی گئی جس سے آپ کی روحانی قوّت میں اضافہ مقصود تھا اور آپ کی ذات میں اس عجیب سفر کے لیے قابلیت اور استعداد پیدا کر کے وہ قوّت عطا کرنی بھی مقصود تھی جو ملائکہ کو حاصل ہے تاکہ تھوڑے وقت میں ملائکہ کی طرح یہ سفر بآسانی طے ہو سکے۔ اگرچہ یہ قوّت ملکی آپ کے لیے وقتی ضرورت کے تحت ہو اور ملائکہ کے لیے دائمی۔ کیونکہ اُن کی آمد و رفت کی ضرورت عالمِ بالا کو دائمی ہے۔ (باقی صفحہ ۳۲ پر)

احسان دانش

شبِ معراج

گردوں پہ تھا اس خاک کا چرچا شبِ معراج
جاگا تھا مدینے کا نصیبا شبِ معراج

اجمال تھا "تفصیلِ صفاتی" سے گریزاں
کس جوش میں تھا ذات کا دریا شبِ معراج

ہر سانس پہ کھلتے تھے خلاؤں میں دریچے
ہر ذرۂ خاکی تھا ستارا شبِ معراج

تھی عرش پہ انسان کے پاپوش کی آہٹ
دُنیا کے محاصل میں تھی عقبیٰ شبِ معراج

لمحات کے سانچوں میں سمٹ آئی تھیں صدیاں
"امروز" تھا آئینۂ فردا شبِ معراج

جلوے بھی نہ تھے عابد و معبُود میں حائل
بے واسطہ تھے بندہ و مَولا شبِ معراج

ہر سُو تھے خلاؤں میں رواں کیف کے جھونکے
تھی کاہکشاں نُور کا دریا شبِ معراج

خوش کام تھے اطراف و جوانب کے مناظر
تھی لاکھ سویروں کا سویرا شبِ معراج

پھُولوں میں بڑھا رنگ ستاروں میں تجلّی
بر آئی دو عالم کی تمنّا شبِ معراج

وہ موجۂ گرداب تھے الطاف و کرم کے
ناپید تھا رحمت کا کِنارا شبِ معراج

پائی نہ رُسولانِ سلف نے یہ بلندی
تھا زیرِ قدم عرشِ مُعلّٰی شبِ معراج

اللہ نے خود چشمِ پیمبر سے اُٹھایا
موجُودیّتِ خلق کا پردا شبِ معراج

اِک سمت تو اُمّت کے گناہوں پہ نظر تھی
اِک سمت تھا سرمایۂ عقبیٰ شبِ معراج

تھی اپنے شبابوں پہ بایمائے خُداوند
ضَو ریزیٔ مہتاب و ثریّا شبِ معراج

ہر بات سے اِک بات کا امکان تھا روشن
ہر حُسن سے سو حُسن تھے پیدا شبِ معراج

اس بات میں خاموش ہیں اب تک کے مہندس
کس رُخ پہ بہا وقت کا دھارا شبِ معراج

اس اَوجِ نبوّت کی خبر کس کو تھی دانشؔ!
اللہ رے انسان کا رُتبہ شبِ معراج

اسلام اور سائنس

حضرت اقدس مولانا مفتی محمود صاحب قدس اللہ سرہ العزیز

اب ہم معتزلہ کے اس عقلی استدلال کا (کہ اعراض نہیں تولے جا سکتے) جواب دیتے ہیں۔ اُن کا جواب اُس زمانہ میں کہ جب سائنس نے ترقی نہیں کی تھی قدرے مشکل تھا، لیکن آج سائنس کی ترقی کے بعد یہ جواب بہت ہی آسان ہوگیا ہے۔

سائنس جوں جوں ترقی کرتی جاتی ہے وحی کے فیصلوں کی تائید ہوتی جاتی ہے۔ اس لیے کہ وحی حقیقت ہی حقیقت ہے، اور سائنس حقائقِ اشیاء کو ہمارے سامنے لاتی ہے۔ بہت سے ایسے مسائل اور ایسے امور ہیں کہ جنہیں مُسلمان تو تسلیم کرتے آئے ہیں، لیکن معتزلہ اور دوسرے گمراہ فرقے اُنہیں ناممکن اور محال کہہ کر تسلیم نہیں کرتے تھے۔ سائنس نے مسلمانوں کی تائید کی اور مخالفین کی تغلیط۔ دوسرے لفظوں میں یُوں کہیئے کہ سائنس نے وحی الٰہی کے فیصلوں کی تائید کی اور ان فیصلوں کے خلاف عقل اور ناممکن سمجھنے والوں کی تغلیط کی۔

مثلاً حضورؐ کا معراج کی رات آسمانوں پہ جانا اور عیسٰی علیہ السلام کا آسمانوں پہ رہنا وحی سے ثابت ہے اور مُسلمان اسے مانتے آئے ہیں لیکن منکرین کہا کرتے تھے کہ یہ ناممکن اور محال ہے کہ کوئی آسمانوں پر چلا جائے۔ دُنیائے کُفر اس پر متفق ہے کہ نہ تو حضورؐ کو معراج ہُوئی اور نہ ہی حضرت عیسٰیؑ آسمانوں پر موجود ہیں۔

اسی طرح دُنیائے کُفر تختِ سلیمانی کا بھی انکار کرتی آئی ہے۔ اہلِ کُفر کا دعویٰ تھا کہ یہ ممکن ہی نہیں کہ تخت ہَوا میں اُڑے، کیونکہ تخت ایک ثقیل چیز ہے اور اثقال بالطبع مائل الی الارض ہوتے ہیں۔ تمام اثقال مرکزِ ثقل کی طرف مائل ہیں، تو عقل کی رو سے وہ اس قسم کے اعتراضات کیا کرتے

تھے۔ لیکن اَب تو سائنس نے دکھا دیا کہ اثقال ہَوا میں اُڑ سکتے ہیں۔ ہَوائی جہاز کو جو بلا شُبہہ ایک ثقیل چیز ہے ہم سب اکثر و بیشتر ہَوا میں اُڑتا ہُوا دیکھتے رہتے ہیں۔ اسی طرح چاند پر انسانوں کے پہنچ جانے سے حضور کی معراج اور حضرت عیسٰی کے قیام علی السماء والا اعتراض بھی ختم ہوگیا، کیونکہ سائنس نے یہ ثابت کر دیا کہ انسان اُوپر جا سکتا ہے۔

یاد رکھیے کہ جو چیز ممکن ہوتی ہے (محال اور ناممکن نہیں ہوتی) تو وہ کبھی تو ظاہری اسباب کے ساتھ وقوع میں آتی ہے اور کبھی باطنی اسباب کے ساتھ۔ گویا ممکن چیز اسباب عادیہ ظاہرہ کے ساتھ بھی وقوع میں آسکتی ہے اور اسباب باطنی غیر عادیہ کے ساتھ بھی۔ ہَوائی جہاز کو اسباب عادیہ ظاہرہ کے ساتھ اُڑایا جاتا ہے۔ اس میں پٹرول ڈالا جاتا ہے، مشینری لگائی جاتی ہے، اُس کی ہیئت کذائی ایسی بنائی جاتی ہے کہ وہ ثقیل ہوتے ہُوئے بھی اُڑتا ہے، ہم نے تو اسباب عادیہ ظاہرہ کے ساتھ کسی ثقیل چیز کو ہَوا میں اُڑایا، مگر اللہ تعالیٰ نے اسباب باطنہ کے ساتھ تخت کو ہَوا میں چلایا۔ غرض سائنس نے یہ ثابت کر دیا اور مشاہدہ کرا دیا کہ ثقیل چیز کا اُوپر جانا یا ہَوا میں اُڑنا ناممکن نہیں بلکہ ممکن ہے تو سائنس سے ہم مُسلمانوں کی تائید ہوگئی ہے۔ اگرچہ ہم مُسلمان یہ باتیں پہلے سے ہی عقیدتاً تسلیم کرتے آئے ہیں، مگر اَب تو سائنس نے مشاہدہ بھی کرا دیا۔

اس قسم کی اور بھی بہت سی باتیں ہیں کہ جنہیں ہم تو تسلیم کرتے آئے ہیں، مگر اہلِ کُفر اُن کا انکار کرتے تھے اور عقل کے خلاف بتاتے تھے۔ مثلاً صحیح بخاری میں ہے کہ حضور اکرمؐ سے پُوچھا گیا کیف یأتیک الوحی یعنی آپ پر وحی کیسے نازل ہوتی ہے۔ آپ نے جواباً ارشاد فرمایا۔ احیاناً یأتینی مثل صلصلة الجرس یعنی کبھی کبھی وحی اس طرح بھی آتی ہے کہ وہ گھنٹی کی آواز کے مانند معلوم ہوتی ہے یعنی ٹن ٹن یا اس طرح کی کوئی اور آواز آتی ہے۔ جسے میں سمجھ لیتا ہوں اور یاد کر لیتا ہُوں۔

تو اس پر کفار یہ اعتراض کرتے تھے کہ صلصلة الجرس یعنی گھنٹی کی آواز سے فصیح و بلیغ کلام کس طرح بنتا ہے، کیونکہ اس میں حروف ہجا نہیں ہیں، کلمے نہیں ہیں، محض ٹن ٹن سے الحمد للہ رب العالمین الرحمٰن الرّحیم جیسا فصیح اور بہترین کلام کیسے بن گیا۔ تو یہ اعتراض اُنہوں نے عقل کے اعتبار سے کیا تھا۔ مُسلمانوں نے حضور اکرمؐ کی بات کو صحیح تسلیم کیا تھا۔

اور یقین کیا تھا کہ جو کچھ آپ فرما رہے ہیں بلا شبہہ دُرست ہے۔ وحی کے سلسلہ میں صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ جب آپؐ پر وحی نازل ہوتی تھی تو کبھی ہم بھی سُنتے تھے۔ صوت مثل دوی النحل کہ ہم وحی کی آواز کو شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی سُنتے تھے۔ مُسلمانوں نے یہ سب باتیں تسلیم کی تھیں مگر کفار نے اُن کا انکار کیا تھا اور کہتے تھے کہ یہ عقلاً ناممکن ہے کہ ٹن ٹن یا شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی آواز سے کوئی بامعنی کلام سمجھا جاسکے۔ آج سائنس نے مُسلمانوں کے اس عقیدے کو بھی عقلاً دُرست ثابت کیا۔ اگر آپ کبھی ٹیلی گرام آفس گئے ہوں تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہاں ایک شخص کے سامنے محض ٹک ٹک ہی ہوتا رہتا ہے، لیکن بعد میں وہ ایک بامعنٰی کلام لکھ لیتا ہے اور متعلقہ شخص کو بتا دیتا ہے۔ تو صرف ٹک ٹک ہی سے اُس نے بامقصد اور بامعنٰی کلام حاصل کرلیا۔ معلوم ہُوا کہ کچھ رموز ہوتے ہیں جنہیں تار دینے والا اور وصول کرنے والا ہی سمجھتا ہے۔ ایسے ہی وحی بھیجنے والے اور وحی وصول کرنے والے کے درمیان بھی رموز ہوتے ہیں۔ یہ بات کہ ٹن ٹن سے کوئی کلام بن سکتا ہے اس زمانہ میں تو سمجھ میں نہیں آتی تھی مگر اَب تو بات صاف ہوگئی اور مسئلہ حل ہوگیا۔ سائنسدانوں نے ٹیلی گرام ایجاد کرکے یہ ثابت کر دیا کہ ٹک ٹک یا اس قسم کی کوئی اور آواز یا الفاظ ہوں تو اُن سے کلام بن سکتا ہے۔ اور مطلب سمجھایا جاسکتا ہے۔

بہت سے لوگ حضرت فاروق اعظمؓ کی اس کرامت کا بھی انکار کرتے تھے کہ اُنہوں نے مدینہ طیّبہ سے ملک شام میں لڑنے والی مُسلمان فوج کے جرنیل کو آواز دی اور اُنہوں نے سُن لی۔ واقعہ یُوں ہے کہ مُسلمانوں کی فوج باہر ایک ملک میں کفّار سے نبرد آزما تھی۔ دوران لڑائی کفار نے مُسلمانوں کا گھیراؤ کرنا چاہا۔ فاروق اعظم مدینہ طیّبہ میں ممبر پر خطبۂ جمعہ دے رہے تھے۔ اللہ نے اس جنگ کی صورتِ حال اُن پر منکشف فرما دی اور آپ نے ممبر پر سے ہی سپہ سالار کو آواز دی کہ یاساریہ الجبل۔ یعنی ساریہ پہاڑ کی طرف دیکھو۔ کہیں دُشمن اس طرف سے حملہ نہ کر دے یا گھیراؤ نہ کرلے۔ حضرت ساریہ نے فاروق اعظم کی یہ آواز سُن لی اور سنبھل گئے۔ تو وہ لوگ جنہیں صاحبِ عقل ہونے کا دعویٰ تھا اس کرامت کو نہیں مانتے تھے۔ اُن کا اعتراض تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ بغیر تار کے بغیر کنکشن یا کسی اور واسطے کے آواز اس قدر دُور پہنچ جائے، مگر اَب سائنس نے دکھا دیا کہ یہ ناممکن نہیں بلکہ ممکن ہے۔ آواز بغیر کنکشن اور بلا کسی واسطے کے بھی ہزاروں میل دُور تک پہنچ سکتی ہے۔ آج ریڈیو کے ذریعہ مکّہ مکرّمہ، لندن

ماسکو اور دُنیا کے دوسرے دُور دراز اسٹیشنوں کی آواز سُنی جاتی ہے، حالانکہ نہ تو کوئی کنکشن ہے نہ تار ہے۔ تو جب مادی اسباب کے ساتھ آواز اس قدر دُور پہنچ سکتی ہے تو روحانی طاقت کے ساتھ ایسا کیوں ممکن نہیں۔ جبکہ رُوح کی طاقت مادہ کی طاقت سے بہت زیادہ ہے، رُوح مخدوم ہے مادہ اس کا خادم ہے، رُوح متبوع ہے اور مادہ اس کا تابع، رُوح حاکم ہے اور مادہ محکوم ہے، تو افضلیت رُوح ہی کو حاصل ہے تو اگر مادی طاقت اور مادی اسباب سے ایک کام سہل الحصول ہے تو روحانی طاقت سے وہ کام بطریق اولیٰ سہل الحصول ہوگا۔ دیکھیئے، حرارت اور برودت دونوں اعراض ہیں اور آج یہ دونوں تولے جاتے ہیں۔ آپ گرمیوں میں روزانہ سُنتے ہوں گے کہ آج درجۂ حرارت یہ ہے اور کل یہ تھا۔ آج گرمی اتنی پڑی۔ فضا میں آج برودت کم یا زیادہ ہے، تو سائنس نے ان دونوں کے تولنے کے لیے میزان بنائی ہے جس سے یہ تولے جاتے ہیں۔

میزان سے مُراد صرف وہ ترازو نہیں ہے جس سے گُڑ وغیرہ تولا جاتا ہے بلکہ ہر چیز کے لیے جُدا جُدا میزان ہوتی ہے۔ آپ اپنے جسم کی گرمی اور حرارت بھی تولتے ہیں جب کبھی ہم میں سے کسی کو بخار ہوتا ہے تو ڈاکٹر ہمارے منہ میں تھرمامیٹر رکھ کر یہ بتا دیتا ہے کہ اتنا بخار ہے، تو بخار تولنے کی ترازو وہ نہیں جس سے پیاز اور گُڑ تولتے ہیں، بلکہ بخار تولنے والی میزان یہی تھرمامیٹر ہے، تو ہر چیز کے لیے الگ الگ ترازو ہوتی ہے، تو اعمال تولنے کے لیے بھی میزان ہے اور خُدا ہی جانتا ہے کہ وہ کیسی ہے۔ بہرحال یہ ثابت ہوگیا کہ اعراض تولے جاسکتے ہیں۔ گرمی اور سردی دونوں کا کوئی جسم نہیں ہے۔ دونوں اعراض ہیں مگر سائنس دونوں کو تولتی ہے، تو آج سائنس کی روشنی میں دنیا پر یہ بات واضح ہوگئی کہ ہمارا یہ عقیدہ کہ اعمال تولے جائیں گے بالکل دُرست اور صحیح ہے۔ اور معتزلہ کا یہ دعویٰ کہ اعمال کا وزن عقلاً مستحیل ہے غلط اور سراسر حماقت پر مبنی ہے۔

ہم تو کہتے ہیں کہ نہ صرف اعمال تولے جائیں گے بلکہ ایک ہی قسم کے دو عملوں میں بھی میزان کے ذریعہ فرق ظاہر کیا جائے گا۔ مثلاً دو آدمیوں نے ظہر کی نماز پڑھی۔ ایک نے زیادہ خضوع و خشوع سے ادا کی، ایک نے خضوع و خشوع کا زیادہ لحاظ نہ رکھا، تو میزان میں خضوع و خشوع سے پڑھی گئی نماز کا وزن دوسری نماز سے زیادہ ہوگا۔ تو نہ صرف نماز تولی جائے گی بلکہ اس

کے اندر جو خضوع وخشوع ہے اس کا بھی وزن ہوگا۔

خلاصہ یہ کہ آج اس سائنسی دَور میں معتزلہ کا دعویٰ خود بخود غلط ثابت ہُوا اور مسلمانوں کے عقیدے کی تائید ہوگئی۔

آج ہم معتزلہ سے کہہ سکتے ہیں کہ تمہارا "کبریٰ" کہ اعراض کا وزن مستحیل ہے صحیح نہیں۔ کیونکہ اس وقت پُوری دُنیا کا اس پر اتّفاق ہے کہ وزن اعراض ممکن ہے، محال نہیں، تو معتزلہ کا مذہب عقلاً بھی صحیح نہیں اور نقلاً بھی۔

بقیہ: شناختی کارڈ

صرف اپنے نام مسلمانوں جیسے رکھتے ہیں بلکہ بیرونی دُنیا میں اسلام کے نام پر اپنے دجل وفریب کی ترویج میں ہمہ وقت مصروفِ کار ہیں اور حرمین شریفین میں بھی مسلمانوں کی حیثیّت سے داخل ہوکر اسرائیل کا حقِ نمک ادا کرتے ہیں۔

آپ نے غور فرمایا ہوگا کہ عیسائی مظاہرے جا بجا ہو رہے ہیں، لیکن قادیانیوں نے کوئی مظاہرہ نہیں کیا، اس خامشی کو کیا ان کی رضامندی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے؟ ہرگز ایسا نہیں ہے بلکہ اُنہوں نے حکمتِ عملی کے طور پر عیسائی بھائیوں کو ڈھال کے طور پر استعمال کیا ہے تاکہ پاکستان کو عالمی سطح پر رسوا کرنے کا ڈھونگ رچا سکیں اور یہی اس پردۂ زنگاری کا معشوق ہے۔ انشاء اللہ قادیانی پہلے کی طرح اس بار بھی خائب وخاسر ہوں گے۔ عیسائی اور دیگر غیر مسلم اقلیّتیں اپنے نفع و نقصان کو خود بہتر طور پر سمجھتی ہیں۔ اگر اُنہیں کوئی فی الواقع تکلیف دے تو اُس کا ازالہ اسلامیان پاکستان اور حکومتِ پاکستان کرنے کے لیے تیّار ہیں، لیکن اُن کو بھی اپنی صفوں میں دوست اور دُشمن کی تمیز کرنا ہوگی۔

بقیہ: اسراءُ معراج

۷۔ رُوحِ محمّدی جو الطف الاشیاء ہے۔ اس کا ایک رات میں جسم پر اثر ڈال کر ایک رات میں طویل سفر کرنا اس کی نظیر لطیف اشیاء میں موجود ہے۔ سورج کی شعاع ۹، کروڑ تیس لاکھ میل چند سیکنڈ میں طے کر کے زمین پر پہنچتی ہے۔ اور شعاعِ بصری اربوں بلکہ کھربوں میل دور کے ستاروں تک آنکھ کی جھپک میں پہنچ جاتی ہے۔

تحریر۔ حضرت اقدس مولانا سیّد حامد میاں صاحب قدس سرّہ

بانی جامعہ مدنیہ لاہور

بجواب تحریر فائل نمبر ۳ (۱۰۷) / ۸۲ —

۔آر۔سی۔آئی۔آئی۔۵۳۲

۸۴-۲-۷

مزارعت

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

محترم ومکرم جناب سمیع اللہ صاحب دام مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

مزارعت کے موضوع پر آپ کی بہت مختصر تحریر موصول ہوئی ہے سوال میں اجمال ہے اس لیے جواب میں چند صورتیں پیش کر رہا ہوں۔

اسلام میں مزارعت کی دو صورتیں تو معروف ہیں۔

۱۔ سفید زمین مزارع کو کرایہ پر دے دی جائے۔ (اجارہ)

۲۔ پیداوار میں کسی تناسب سے حصہ طے کر کے مزارع کو زمین دے دی جائے (بٹائی) فقہ حنفی میں ہر دو صورت کا جواز ہے جو بھی اختیار کر لی جائے جائز ہوگی، البتہ اوّل الذکر صورت افضل ہے

اگر سوال نامہ کا مقصد یہ دریافت کرنا ہے کہ کیا اصلاح اراضی کے عنوان سے زمین ضبط کر کے مزارع کو دی جا سکتی ہے یا نہیں؟ اور مزارع کو بے دخل کرنے کا حق زمیندار سے چھینا جا سکتا ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ کسی کی جائز مملوک زمین اس سے نہیں چھینی جا سکتی اور بہر صورت اسلام میں مالک زمین کو یہ حق حاصل رہے گا کہ مدّت معاہدہ کے بعد اپنی زمین مزارع سے واپس لے لے۔

البتہ ملکی پیداوار بڑھانے اور غریب کاشتکار کو نفع پہنچانے کی یہ صورت نکالی جا سکتی ہے کہ بڑے زمیندار

کے پاس صرف حسبِ حیثیّت گزارہ کی مقدار میں زمین چھوڑ کر باقی زمین ساری کی ساری حکومت مستعار لے لے اور کاشت کرے۔ یا غریب مزارعین کو ایک محدود عرصہ کے لیے مستعار دلا دے کہ وہ کاشت کریں ساری آمدنی خود استعمال کریں بچوں کی تعلیم و تربیت اور اپنی اقتصادی حالت ٹھیک کریں مالک زمین کو کچھ نہ دیں، لیکن زمین کی ملکیت مالک ہی کی تسلیم کریں۔

مثلاً ایک شخص کے پاس سو مربعے زمین ہے اور اس کے اپنے مصارف بود و باش بچّوں کی تعلیم و تربیت کے اخراجات چالیس مربعوں کی آمدنی میں پُورے ہو سکتے ہیں تو اتنی زمین اس کے تصرف میں رہنے دی جائے اور باقی ساٹھ مربع زمین ایک ایک مربع یا نصف نصف مربع مزارعوں کے تصرف میں پانچ پانچ یا دس دس سال کے لیے دے دی جائے۔

اس عرصہ کے بعد اگر مالک زمین یہ درخواست دے کہ میں اپنے لڑکے کی شادی کر کے اسے علیحدہ آباد کرنا چاہتا ہوں مجھے زمین کی ضرورت ہے تو اُس وقت بقدر کفایت زمین مزارعوں سے لے کر مالک کو واپس دے دی جائے گی۔ اور اس کے لیے مالک زمین کو عدالت میں فقط ایک درخواست دینی ہوگی

دوسری طرف اتنے عرصہ میں مزارع کی اولاد بھی لکھ پڑھ کر خود کفیل اور برسرِ روزگار ہو جائے گی، بلکہ اگر مزارع زیادہ محنت اور سمجھ داری سے کام لے گا تو اس زمین کی آمدنی سے اپنی زمین الگ خرید سکے گا۔ جس پر بعد میں وہ اپنا گزارہ کرتا رہے۔ اسے زمین کا قبضہ واپس دینے سے کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ اگر اس نے اس عرصہ میں محنت سے کام کیا اور پیداوار بڑھائی تو اس سے جہاں اسے فائدہ ہوگا وہاں ملک کو بھی فائدہ پہنچے گا اور اُمّید یہی ہے کہ جب وہ یہ جانتا ہوگا کہ یہ زمین مجھے پانچ یا آٹھ یا دس سال کے بعد واپس دینی ہے تو زیادہ محنت کرے گا اور مالک زمین جب یہ جانتا ہوگا کہ زمین کی ملکیت میری ہی قائم رہے گی تو اُسے ضرورت سے زائد زمین دینے میں تردد اور پریشانی نہ ہوگی اور زیادہ پیداوار سے ملک کی خوشحالی میں اضافہ ہوگا۔

اصلاح اراضی کی یہ صورت کہ حکومت بڑے زمینداروں کی زمین ضبط کر کے کاشتکاروں میں تقسیم کر دے اور انہیں مالک بنا دے تو یہ اسلامی قوانین کے تحت اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ زمیندار نے یہ زمین ناجائز ذرائع سے حاصل کی ہو۔ مثلاً کسی اسمگلر نے اسمگلنگ کی آمدنی سے اور کسی بہت بڑے کارخانہ دار نے اس کارخانہ کی آمدنی سے جتنی زمین خریدی ہوگی وہ حکومت کی ہوگی۔ ایسی آمدنی کا حقدار بیت المال (اسٹیٹ بینک) ہوگا۔ اور یہ حکومت کی اپنی ضروریات اور رعایا کے مستحق یا بے روزگار افراد پر خرچ ہوگی،

(باقی صفحہ ۴۳ پر)

شیخ الحدیث حضرۃ علامہ مولانا سید محمد میاں

جمہوریت اپنے آئینے میں

اور

اسلامی نظامِ حکومت کا مختصر خاکہ

آج دُنیا میں رُوس اور امریکہ کے درمیان سرد جنگ جاری ہے۔ ہر ایک بلاک دوسرے کو مرعوب کر رہا ہے یہ میدان مسلمانوں سے خالی ہے۔ بین الاقوامی سیاست میں مُسلمانوں اور اُن کی تمام مملکتوں کا شمار پسماندہ اقوام میں ہوتا ہے۔ حاشا وکلّا قرآن حکیم مسلمانوں کے لیے یہ ذلّت گوارا نہیں کرتا۔ قرآن پاک کی تلقین یہ ہے کہ "کلمۃ اللہ ھی العلیا" اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے مُسلمانوں کو یہ نعرہ دیا تھا۔ الاسلام یعلو ولا یعلی علیہ (اسلام بلند ہوکر رہتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ دوسروں کو اسلام پر بلندی حاصل ہو) سائنسی تحقیقات اور ترقی کا کام دوسروں نے لے لیا۔ اسی راستہ سے وہ دُنیا پر چھائے ہُوئے ہیں اور تمام دنیا کو مرعوب کر رہے ہیں۔ قرآن حکیم کی تعلیم اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے بموجب اسلامی حکومت کو ایسا بیدار مغز ہونا چاہیے کہ اس میدان میں بھی اس کا قدم سب سے آگے رہے۔ وہ کسی کے دست نگر نہ رہیں، دوسروں کو اُن کا دستِ نگر رہنا چاہیے۔

وہ اللہ کے سوا کسی دوسرے سے خائف نہ ہوں۔ دوسروں پر ان کی دھاک رہنی چاہیے۔ (سورہ ۹ توبہ آیت ۱۲۳)

اس ترقی اور برتری کے لیے بہت زیادہ دولت کی ضرورت ہے۔ زکوٰۃ و صدقات اور عشر جو خوشحال مُسلمانوں پر فرض ہوتے ہیں۔ وہ ضرورت مند، عیال دار، فقراء و مساکین کا حصّہ ہیں۔ ان کی رقومات ان مدات پر ہی خرچ کی جائیں گی۔ ترقی اور استحکامِ قوت کے مدات پر خرچ نہیں ہوسکتیں۔

خراج جزیہ اور اسلامی تعلیم کے بموجب عشور یعنی درآمد و برآمد مال کے ٹیکس اور اس طرح کے معینہ مدّات کی آمدنی اگر ان ضرورتوں کے لیے ناکافی ہو (جو ترقّی پذیر تعلیم و تربیت اور ریسرچ و تحقیقات اور سامانِ جنگ

کی فراہمی وغیرہ کے سلسلے میں رونما ہوں) تو مجلس شوریٰ یہاں اپنا فرض انجام دے گی یعنی ماہرین کی امداد سے ذرائع آمدنی میں اضافہ کرے گی

کارخانے اور فیکٹریاں

یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ لوگ اپنی محنت اور اپنی گاڑھی کمائی سے کارخانے اور مِل قائم کریں اور حکومت ان کو نیشنلائز کر کے اپنے قبضہ میں لے لے ، حکومت کو غاصب نہ ہونا چاہیے بلکہ حکومت کو ایسا فرض شناس ہونا چاہیے کہ وہ پہلے ہی اپنی طرف سے بڑے بڑے کارخانے قائم کر کے اپنی آمدنی میں اضافہ کر لے۔

ترقیاتی پلان اور منصوبے آج بھی پارلیمنٹ اسمبلی یا مجلسِ وزراء نہیں بناتی۔ بنانے والے اور ہوتے ہیں پارلیمنٹ اُن کی منظوری دیتی ہے۔ کیا اچھا ہو کہ شوریٰ کے ارکان وہ ماہر ہوں جو اس طرح کے منصوبے بنا سکیں آخر ایسے ہی ماہرین کو شوریٰ کا (پارلیمنٹ کا) ممبر کیوں نہیں بنایا جاتا، کیا وہ عوام کی ضرورتوں اور رجحانات سے بے خبر ہوتے ہیں؟ وہ عوام کی نمائندگی کیوں نہیں کر سکتے۔

خسارہ پورا کرنے والا آمدنی کا ایک مَدّ

قرآن حکیم نے ایک مستقل مد قرار دے دیا ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ (راہ خدا میں خرچ کرنا) چنانچہ سورۂ انفال کی مذکورہ بالا آیت کا آخری حصّہ یہ ہے۔

اللہ کے راستہ میں جو کچھ تم خرچ کرو گے وہ تم کو پُورا پُورا ادا کیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

(انفال آیت ۶۰)

سورۂ محمدؐ کی آخری آیت کا مفہوم یہ ہے۔

تم کو دعوت دی جا رہی ہے کہ تم راہ خدا میں خرچ کرو۔ تم میں سے کچھ وہ ہیں جو اس دعوت کے جواب میں بخل سے کام لیتے ہیں (خرچ نہیں کرتے) دیکھو یہ اگر بخل کرتے ہیں تو اپنے سے (اپنے مفاد سے) بخل کر رہے ہیں۔ اللہ کو ضرورت نہیں، وہ بے نیاز ہے۔

(اعلیٰ تعلیم، ترقی پذیر تربیت، سائنسی ایجادات و ترقیات یہ تمہاری ضرورتیں ہیں) تم ہی ضرورت مند ہو (خود تمہاری باعزت بقا کے لیے ان کی ضرورت ہے)

اگر تم مُنہ موڑتے ہو تو تم ختم ہو جاؤ گے اللہ تمہارے بدلہ میں کسی دوسری قوم کو کھڑا کرے گا جو تم جیسی تن آسان، فرض ناشناس اور مفاد پرست نہیں ہو گی۔

سورہ بقرہ میں جنگ وقتال کے متعلق ہدایات دینے کے بعد ارشاد ہے :

خرچ کرو اللہ کے راستہ میں اور نہ ڈالو اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں بربادی اور ہلاکت میں (آیت ۱۹۵)

قرآنِ حکیم میں اس انفاق فی سبیل اللہ کو "قرض حسن" سے تعبیر کیا گیا ہے

یہ گویا قومی یا ملّی قرض ہوتا ہے۔ ہماری حکومتیں بھی قومی یا جنگی قرض لیتی ہیں جن کا سود بھی ادا کرتی ہیں، مگر اس سود کے نتیجہ میں ان قومی اور جنگی قرضوں کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ دولت مند جو قرض دینے والے ہیں اُن کی دولت بڑھ جاتی ہے اور اس تمام قرض کا بار ملک کے تمام غریب ٹیکس دینے والوں پر پڑتا ہے

دولت مند یہ قرض دے کر بظاہر قوم کی خدمت کر رہا ہے، لیکن فی الحقیقت قوم کا خُون چُوس رہا ہے۔ اور اپنی امیری بڑھا رہا ہے۔ قرآن حکیم جس قرض کا مطالبہ کرتا ہے اس کا کوئی بار غریب اور محنت کش طبقہ پر نہیں پڑتا۔ صرف دولت مند پہ اس کا بار پڑتا ہے۔ اسی کی گرہ میں سے اس کی خالص پونجی خرچ ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ وعدہ بھی ہے۔

"کہ تم کو پُورا پُورا ادا کیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں ہوگا۔" (سورہ انفال آیت ۶۰)

اس پُورا پُورا ادا کرنے کی شکل یہ ہے کہ ترقیات کے مفادات سے یہ دولت مند بھی بہرہ اندوز ہوں گے، چنانچہ :

جن صحابہ کرام (رض) نے ارشاد خداوندی کی تعمیل کرنے کے لیے خرچ کیا تھا ان میں بہت سے وہ بھی تھے کہ ثواب آخرت کے علاوہ دُنیا میں بھی اُن کو پُورا پُورا بلکہ پُورے سے بھی بہت زیادہ ادا کر دیا گیا۔

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کی حالت ابتداء زمانہ میں یہ تھی کہ اُن کی اہلیہ محترمہ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا اُونٹ کے چارے اور چولھے کے سوختے کے لیے گٹھلیوں وغیرہ کا بار دو تین میل کے فاصلہ سے خود اپنے سر پر رکھ کر لایا کرتی تھیں مگر تقریباً تیس سال بعد جب وہ شہید ہوگئے تو ان کا ترکہ پانچ کروڑ سے زیادہ کا تھا جو قطعاً جائز اور پاک آمدنی سے حاصل ہُوا تھا۔ جبکہ تمام غزوات میں پیش پیش رہے تھے۔ اور کروڑوں درہم راہ خدا میں خرچ کیے تھے۔ (بخاری شریف ص ۴۴۱، ۴۴۲)

دوسری شکل

اور پُورا پُورا ادا کرنے کی دوسری شکل یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اُن کے مدارج اتنے بڑھائے جائیں کہ ان کا اندازہ لگانا مشکل ہو۔ وہ اس زمرہ میں ہوں جن کو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کی طرح "منعم علیہم" فرمایا ہے اور ان کو ابدی حیات کی بشارت دی ہے۔

بہرحال اس قرض کی ادائیگی باشندگان ملک کی جیب سے نہیں ہوگی۔ ارکان شوریٰ کا فرض ہوگا کہ اسلامی مملکت کی ترقی پذیر ضرورتوں کا جائزہ لیں۔ ان کا بجٹ بنائیں۔ بجٹ کو پورا کرنے کے لیے قرض حسن حاصل کریں۔ دولت مندوں کا فرض ہوگا کہ جو اُن کے ذمے کیا جائے وہ اس کو خوشدلی سے ادا کریں، یہ اُن کے لیے ذخیرۂ آخرت ہوگا۔ زکوٰۃ کی طرح اس کی ادائیگی بھی فرض ہوگی اور زکوٰۃ کی طرح اس کا ثواب بھی بیش از بیش ہوگا، جس کی تائید بے شمار آیات اور احادیث سے ہوتی ہے۔

اس قرض لِلّٰہ اور فی سبیل اللہ کی شرح کیا ہوگی۔ اگر امام از خود کسی آرڈی ننس سے طے کر دیتا ہے تو ایک طرح کا جبر ہوگا، لیکن اگر ارکان شوریٰ جو با اثر اور بارسوخ بھی ہوں وہ طے کرتے ہیں تو سب کے لیے قابلِ برداشت ہوگا۔

اسی طرح ترقی پذیر اعلیٰ تعلیم اور تربیت کی ضرورتیں ہیں۔ ان کے مصارف بھی ایسی ہی آمدنی یا قرض لِلّٰہ سے پورے کیے جائیں گے۔ شوریٰ کا فرض ہوگا کہ ان تمام ضرورتوں کا جائزہ لے کر بجٹ بنائے۔ ممکن ہے اس کو قانون سازی کہہ دیا جائے، مگر ہمارے خیال میں یہ قانون اور "لا" نہیں بلکہ یہ حکم خداوندی کے نافذ کرنے کی صورتیں ہیں۔

دولت کا اندازہ

زکوٰۃ کی رقم ان مدات میں خرچ نہیں کی جائے گی، البتہ زکوٰۃ سے دولت کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس نے ایک ہزار روپیہ زکوٰۃ میں دیا ہے، اس کا کل اثاثہ چالیس ہزار ہوگا۔

بہرحال اس قسم کے کام ہوں گے جن کو ارکان شوریٰ زیرِ قیادت امام انجام دیں گے۔ (یہ ہے اسلامی نظامِ حکومت کا مختصر خاکہ)

○

اس تاریخی حقیقت پر سلسلۂ کلام کو ختم کیا جاتا ہے کہ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم جو رحمۃ للعالمین بنا کر مبعوث کیے گئے تھے۔ سب سے پہلے آپؐ ہی نے دفاع کے لیے خندق کی تجویز منظور فرمائی۔ عرب اس سے قطعاً ناآشنا تھے۔ جب حملہ آوروں نے جن میں تقریباً پورے عرب کے قبائل تھے، دفاع کا یہ نیا طریقہ دیکھا تو حیران رہ گئے۔ اگرچہ فتح نصرتِ خداوندی سے ہوئی، مگر یہ خندق دشمن کی ناکامی کا پیش خیمہ بن گئی۔

پھر آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم ہی نے سب سے پہلے منجنیق اور دبّابہ کو استعمال کرایا، جب آپؐ قلعہ طائف پر حملہ کر رہے تھے، یہ اس زمانہ کے ترقی یافتہ آلاتِ حرب تھے جن کو تاریخِ اسلام میں سب سے پہلے

(باقی صفحہ ۵۳ پر)

شیخ العرب والعجم

مولانا سیّد حسین احمدؒ مدنی

تحریکِ ولی اللّٰہی کا آخری جنرل

تحریر: حافظ تنویر احمد شریفی

ناظم مجلس یادگار شیخ الاسلامؒ پاکستان

حکیم الاُمّت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی فکر و نظر، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ کے علوم و معارف، امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے جامع کمالات کے مظہر، حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی نور اللہ مرقدہٗ کی حُبّ الوطنی کے قالب میں ڈھلی ہُوئی سیاست کے پیروکار اور اس جماعت شیخ الہندؒ و تحریک ولی اللّٰہی کے آخری مجاہد، سپاہی، جنرل، حکیم الامّت حضرت مولانا شاہ محمّد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ العزیز کے معتمد، شیخ العرب والعجم حضرت الامام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ تعالیٰ۔ "رھبان فی اللیل و فرسان فی النھار" کے صحیح مصداق تھے۔

الشیخ عبد المنعم النمر الازہریؒ[1] فرماتے ہیں "ایک طویل مُدّت سے اوراقِ تاریخ کسی ایسی ہستی کے تذکرہ سے خالی تھے۔ جو مختلف خُوبیوں کا سنگم اور اُن کے اسلاف کا پُورا نمونہ ہو۔ غرضیکہ قدرت نے مولاناؒ کے ذریعہ سیاست کو نوازا، مسند علم کو رونق بخشی، خلوص و للّٰہیت کو آشکارا کیا، جذبۂ جہاد و حریّت کو عزت دی اور تاریخ و تصوف میں ایک زریں باب کا اضافہ فرمایا۔ مولانا حسین احمدؒ بے نظیر سیاست دان تھے۔ ایسی سیاست جس میں

---

[1] شیخ عبد المنعم النمرؒ۔ جامعہ ازہر کی طرف سے دار العلوم دیوبند (ہند) میں متعین رہے۔ دیوبند میں قیام کے دوران اُنھوں نے ہندوستان میں مسلمان جماعتوں اور تحریکوں کا بغور جائزہ لیا اور کتاب تحریر کی۔ ہند سے واپسی کے بعد الازہر میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہُوئے۔ بعد میں مصر کے وزیرِ اوقاف بنے۔ چند سال پہلے وفات پائی۔ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

انتہاء سمندر کی سی وسعت، گہرائی اور سکون ہو، نہایت پاکیزہ زمزم کے چھینٹوں سے دھلی ہوئی، حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی فضاؤں میں پروان چڑھی ہوئی سیاست، وہ سیاست جو شیخ الہندؒ کے حب الوطنی کے قالب میں ڈھلی ہوئی تھی۔" (نئی دنیا۔ عظیم مدنی نمبر)

پیدائش: آپؒ کی ولادت ۱۹، شوال المکرم ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۶ اکتوبر ۱۸۷۹ء میں ضلع اناؤ کے قصبہ بانگرمئو میں ہوئی۔ آپؒ کے والد ماجد جناب سیّد حبیب اللہ صاحبؒ، حضرت مولانا فضلِ رحمٰن گنج مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفۂ خاص تھے۔ والد محترمؒ نے اس مستقبل کے قائد کا نام حسین احمد رکھا۔ اور تاریخی نام چراغ محمد ہے۔ نسباً سید تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب ۳۲ واسطوں سے سیّدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے جاکر ملتا ہے۔

ابتدائی تعلیم: والد محترم رحمہ اللہ نے حضرت شیخ الاسلام کو چار سال کی عمر میں قاعدہ بغدادی شروع کرایا اور والدۂ ماجدہ مرحومہ نے نگرانی کی۔ اور ساتھ ہی والد محترمؒ کے اسکول میں درجۂ اوّل میں داخلہ کر دیا گیا۔ اس زمانۂ طالب علمی میں والد محترمؒ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّتوں پر عمل پیرا ہونے کی عادت ڈلوائی۔ آپ کے والد نے ایک بکری پالی ہوئی تھی اور آپ کی ذمّہ داری یہ تھی کہ ایک میل کی دُوری پر واقع اسکول جاتے وقت اور فارغ اوقات میں بکری اور اُس کے بچّوں کو جنگل میں چرایا کرتے تھے۔

مولانا مفتی محمد سلمان منصوری مدظلہٗ فرماتے ہیں کہ

"۴، ۵ سال کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ بظاہر یہ ذمّہ داریاں پہاڑ معلوم ہوتی ہیں۔ یہ پابندیاں قید نظر آتی ہیں۔ یہ دار و گیر ظلم دکھائی دیتا ہے۔ مگر یہ باتیں عام انسانوں کے لیے ہوں تو ہوں! جو لوگ اس عالم میں آفتاب بن کر چمکتے ہیں اُن کی ابتدا انہی نام نہاد مظالم سے ہُوا کرتی ہے۔ جن کی قسمت میں خدمتِ دین کے لیے کانٹوں پر چلنا لکھا ہوتا ہے انہیں شروع ہی سے کانٹوں کے بستر پر لٹا کر تربیت دی جاتی ہے۔" (شیخ الاسلامؒ۔ حیات و کارنامے)

اسی زمانہ میں اُردو، حساب، جغرافیہ میں نہایت درجہ کمال حاصل ہوگیا تھا اور اُدھر قرآنِ پاک ناظرہ ختم ہوگیا۔ ابھی آپ کی ۸ سال کی عمر تھی۔ اس کے بعد فارسی کی ابتدائی تعلیم شروع کی۔

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ:

۱۳ سال کی عمر میں صفر ۱۳۰۹ھ میں والد محترم نے آپ کو مزید تعلیم کے خیال سے دیوبند بھیج دیا۔ دیوبند کی فضا راس آئی اور کھیل کود کا کسی قدر مشغلہ جو وطن میں تھا سب چھوڑ چھاڑ کر یکسوئی سے تعلیم میں لگ گئے۔ اپنی محنت اور شوق، پھر بھائیوں کی نگرانی اور اساتذہ کی توجہ سے تعلیم و تعلم سے مکمّل رغبت و مناسبت ہوگئی۔ دیگر اساتذہ کے

علاوہ حضرت شیخ الہندؒ کے لطف وکرم اور توجّہ کا مرکز رہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے پاس اگرچہ اُونچے درجہ کی کتابیں تھیں مگر اُنھوں نے آپ کو بعض ابتدائی اور متوسطات کُتب بھی پڑھائیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو حضرت شیخ سے غایت درجہ انس تھا تعلّق تھا۔

آپ کے اساتذۂ کرام

آپ نے دارالعلوم دیوبند جو ازہر الہند بھی کہلاتا ہے میں جید اور اپنے وقت کے مقتدر علماء سے فیض حاصل کیا۔ آپ نے جن اساتذہ سے فیض حاصل کیا اُن کے اسمائے گرامی اور جو کتابیں پڑھیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ دستور المبتدی، مراح الارواح، مفید الطالبین، زنجانی، شرح تہذیب، تہذیب، نفحۃ الیمن، مرقات، قطبی، شرح عقائد نسفی، مطول، بُخاری شریف، ترمذی شریف اور ابوداؤد شریف مؤطاء امام مالکؒ، ومحمدؒ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ سے،

۲۔ فصول اکبری، حضرت مولانا ذوالفقار علی دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ (والد حضرت شیخ الہندؒ) سے۔

۳۔ صرف میر، زبدہ، نحو میر، پنج گنج اور جلالین شریف حضرت مولانا حکیم محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ سے،

۴۔ میزان ومنشعب اور ایساغوجی، حضرت مولانا صدیق احمد مدنی رحمہ اللہ (برادر اکبر حضرت شیخ الاسلامؒ) سے،

۵۔ کافیہ، ہدایۃ النحو، اصوالشاشی، منیۃ المصلی، شرح جامی، کنز الدقائق اور شرح وقایہ، مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ سے،

۶۔ شرح جامی بحث اسم حضرت شمس العلماء مولانا حافظ محمّد احمد قاسمی رحمۃ اللہ علیہ سے

۷۔ تلخیص المفتاح، شیخ المحدثین حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری مہاجر مدنی قدس سرہٗ سے۔

۸۔ خلاصۃ الحساب، رشیدیہ، میبذی، ہدایۃ الحکمۃ، میرزاہد رسالہ وکلاں، سراجی حضرت مولانا منفعت علیؒ سے،

۹۔ نورالانوار، حسامی، مشکوٰۃ شریف، شمائلِ ترمذی اور قاضی مبارک حضرت مولانا غلام رسول نغویؒ سے،

۱۰۔ دیوان متنبی، مقامات حریری، حضرت مولانا حبیب الرّحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ سے،

۱۱۔ نسائی شریف، حمد اللہ حضرت مولانا عبدالعلی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھیں۔

اس کے علاوہ صغریٰ کبریٰ، قدوری، میزان منطق، اقلیدس وغیرہ بھی پڑھیں، لیکن یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ کن سے پڑھیں، اس کے بعد آپ ۱۳۱۶ھ مطابق ۱۸۹۹ء میں فارغ ہُوئے۔ اس کے ساتھ ہی والد محترم نے مدینہ ہجرت کا ارادہ فرمایا اور سارا خاندان مدینہ طیبہ چلا گیا۔

حضرت شیخ الہندؒ نے رخصت کرتے ہوئے تاکید کے ساتھ فرمایا کہ تدریس سے غافل نہ ہونا، خواہ ایک دو ہی طالب علموں کو پڑھاؤ۔ مدینہ منوّرہ پہنچ کر استاذؒ کی ہدایت پر عمل فرمایا۔ عربی بولنے پر مکمل قدرت نہ ہونے پر شروع میں قدرے پریشانی کا سامنا ہوا۔ اس لیے ابتداءً حلقہ درس مختصر رہا۔ مگر جلد ہی اس پر قابو پالیا اور حلقہ درس وسیع ہونے لگا۔ یہاں تک عرب و ہند کے علاوہ متعدّد دوسرے اسلامی ممالک کے بھی طلبہ اور شائقین علم شریک ہونے لگے۔ اور تقریباً ۱۲ سال تک حضور علیہ السلام کے روضۂ مبارک کے سائے میں بیٹھ کر آپ نے درس دیا۔ جس چبوترہ پر بیٹھ کر آپ پڑھاتے تھے وہ آج بھی موجود ہے۔ اور طلبا دو طرف بیٹھا کرتے تھے، دائیں طرف، حضرت سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے مکان کے آگے اور بائیں طرف حضور علیہ السلام اور حضرت شیخین رضی اللہ عنہما کے قدمین کی طرف

مدینہ شریف میں تدریس کے دوران کئی بار آپ ہندوستان تشریف لائے، لیکن دیوبند میں زیادہ قیام نہ رہا۔ ۱۳۲۶ھ میں جب آپ ہندوستان تشریف لائے تو دیوبند میں کافی قیام کا موقع مل گیا۔ اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ نے حضرت شیخ الہندؒ کے اسباق میں شرکت کو غنیمت جانا۔ اور اس طرح آپ نے حضرت شیخ الہندؒ سے دوبارہ بخاری اور ترمذی پڑھی۔ اس سال آپ کے شریک سبق شیخ الحدیث حضرت مولانا فخر الدین مراد آبادی، جامع المعقول والمنقول حضرت علامہ محمد ابراہیم بلیاوی، رحمہما اللہ بھی تھے۔ حسنِ اتفاق کہ اس زمانہ میں رئیس القلم حضرت مولانا سیّد مناظر احسن گیلانیؒ بھی دارالعلوم میں مقیم تھے اور حضرت شیخ الہندؒ سے استفادہ کرتے تھے۔ حضرت مدنیؒ کی تشریف آوری کے بعد درس شیخ الہندؒ کا کیا رنگ انہوں نے دیکھا۔ انہی کی زبانی سنیے۔

> ان ہی دنوں میں جب شیخ الہندؒ جیسے شیخ وقتؒ سے پڑھنے کا موقعہ میسر آیا تھا۔ حضرت شیخ مدنیؒ اچانک مدینہ منوّرہ سے دیوبند تشریف فرما ہوئے اور تشریف لاکر مسجد نبوی کے حلقۂ حدیث کا شیخ درس طالب علم بن کر طلبۂ بخاری کی جماعت میں شریک ہوگیا۔ شیخ الہندؒ استاذ تھے اور شیخ مدنیؒ شاگرد۔ درس کے جس حلقہ کا یہ رنگ قائم ہوگیا ہو وہاں غریب طلبہ کا وجود اگر عدم بن کر نہ رہ گیا ہو تو اس کے سوا اور ہوتا کیا؟ قاری بخاری کے اب شیخ مدنیؒ تھے اور سارے طلبہ سامع بن گئے۔ اب کیا بتاؤں کہ اس عجیب وغریب درس میں

کیا دیکھا کیا سنا ؟ جنہوں نے نہیں دیکھا اور نہیں سُنا سوچ ہی کر اُن کو اندازہ کرنا چاہیے کہ ایک کمسن مشق فاضل جلیل طالب علم بن کر اپنے حد سے زیادہ شفیق استاذ گرامی سے کیا پُوچھتا تھا اور کیا جواب پاتا تھا۔ سوال وجواب کی خاص منزل تک پہنچنے کے بعد یہ واقعہ ہے کہ طلبہ کی اکثریت بارود ڈال کر بیٹھ جاتی تھی۔ ایک ایک مسئلہ پر شیخ ہندؒ اور شیخ مدینہؒ کے درمیان دیر تک گفتگو ہوتی رہتی۔ میدان کے دو کھلاڑیوں کے داؤ پیچ کا یہ تماشہ بڑا دلچسپ تماشا تھا۔" (ماہنامہ تذکرہ دیوبند)

اس سال بھی آپ دارالعلوم بحیثیت طالب علم ہی مقیم رہے۔ پھر شوال ۱۳۲۸ھ میں مجلس شوریٰ نے آپ کو مدرس مقرر کیا اور اعلیٰ درجات کی کتابیں آپ سے متعلق کیں۔ اسی سال دستار بندی کا عظیم الشان جلسہ بھی ہُوا جس میں محدثِ کبیر حضرت علامہ سیّد محمدؒ انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے بعد آپ کی دستار بندی کی گئی۔ آپ کو تین دستار عطا کی گئی تھیں۔

۱۔ سبز دستار، دارالعلوم دیوبند کی طرف سے۔

۲۔ ایک دستار حضرت حکیم مسعود احمد گنگوہیؒ بن حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی طرف سے۔

۳۔ ایک دستار حکیم احمد رام پوریؒ کی طرف سے۔

بقیہ: مزارعت

کیونکہ ہر ایسا کاروبار کہ جس کا بار بین الاقوامی کرنسی میں بیت المال پر پڑتا ہو وہ کسی فرد واحد کی ملکیت نہیں نہیں بن سکتا، بلکہ وہ حکومت کا اور حکومت کے توسط سے عوام کا حق اور ان کی ملکیت ہوگا۔ اسمگلنگ اور بڑے ملزِ جو درآمد کیے جاتے ہیں ایسے ہی کاروبار ہیں کہ جن کا بار بواسطۂ کرنسی بیت المال پر اور اس کے واسطہ سے عوام پر پڑتا ہے اس لیے ایسے مال سے اور حکام کی رشوت وغیرہ کی آمدنی سے حاصل کردہ زمینوں اور املاک کو حکومت ضبط کر سکتی ہے اور مستحقین کو اپنی طرف سے دے سکتی ہے۔ ضرورت مندوں میں تقسیم کر کے اس کا مالک بنا سکتی ہے۔

○

اگر میری اس تحریر سے آپ کے سوال کا مقصد پُورا نہ ہُوا ہو تو وضاحت سے تحریر فرمائیں تاکہ جواب دیا جا سکے۔

شاعر اسلام سیّد امین گیلانی

تیّاری کرو

کفر سے پھر بڑھ کے ٹکرانے کی تیّاری کرو
جی نہ ڈھاؤ کفر کو ڈھانے کی تیّاری کرو

کفر ہے مایوسی و ماتم مسلماں کے لیے
پھر سے تم میدان میں آنے کی تیّاری کرو

کفر کی تقدیر میں ہے آگ ہی انجام کار
کفر پر تم آگ برسانے کی تیّاری کرو

کون جیتا، کون ہارا، مان لیں گے خود عدو
شرط یہ ہے خود کو منوانے کی تیّاری کرو

شیر ہو جاتا ہے جب زخمی غضب ڈھلتا ہے پھر
تم بھی بھارت پر غضب ڈھانے کی تیّاری کرو

سومناتی بلبلا اٹھیں لگائیں گے وہ ضرب
غزنوی کا دور دُہرانے کی تیّاری کرو

ڈھاکہ و کشمیر کیا، کلکتہ و دہلی پر اب
پرچم اسلام لہرانے کی تیّاری کرو

دارالافتاء جامعہ مدنیہ لاہور

مستفتیین و مستفسرین کے اسمار گرامی خود ان کی ہی مصلحت کے پیش نظر محذوف ہیں۔

حضرت مولانا ڈاکٹر عبد الواحد زید مجدہم، مدرس، نائب مفتی و فاضل جامعہ مدنیہ

سوال نمبر ا

ایک مفسرِ قرآن جامعہ کے طلبا کو ایمان "حقیقی" کے موضوع پہ کلاس میں لیکچر دے رہے تھے۔ اسی دوران اُنہوں نے جناب رسُول اللہ صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم اور جناب ابوبکرؓ کے درمیان عجیب انداز سے موازنہ کیا۔ اُن کا یہ لیکچر آڈیو کیسٹ میں ریکارڈ میرے پاس موجود ہے، مذکورہ بالا "موازنہ" کو مَیں نے صفحہ قرطاس پر من وعن نقل کر دیا ہے

صفحہ قرطاس

جہاں فطرت صحیحہ اور عقلِ سلیم ہو گی۔ ان دونوں کے امتزاج سے ایمان وجود میں آئے گا۔ یہ ابوبکرؓ ہیں فطرت صحیحہ اور عقل سلیم کی کامل مثال۔ لہٰذا وہ تو پہنچے ہُوئے تھے وہاں تک۔ جس بات کی حضورؐ نے دعوت دی ہے۔ اُنہوں نے پُوچھا کوئی دلیل ہے کوئی دلیل یا معجزہ مانگا ابوبکرؓ نے۔ وہ تو پہنچے ہُوئے تھے۔ اُن کے لیے کوئی بات تھی ہی نہیں۔ حضور جو فرماتے ہیں کہ مَیں نے جس کے سامنے بھی دعوت رکھی ہے اُس نے کچھ نہ کچھ توقف ضرور کیا ہے سوائے ابوبکرؓ کے۔ ایک لمحے کا توقف نہیں۔ وہاں خود کھڑے ہُوئے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ محمدؐ بھی کھڑے تھے دروازے کے باہر۔ ابوبکرؓ بھی کھڑے تھے۔ دستک دونوں ہی دے رہے تھے۔ دروازہ کھُلا۔ اللہ تعالیٰ نے محمدؐ کو اندر لے لیا۔ اتنا ہی ہے نا۔ وحی اُن (محمدؐ) پر نازل ہو گئی۔ باقی جو باہر رہ گیا اس کے اندر حسد پیدا نہیں ہُوا۔ یہ رقیبانہ احساس تو دراصل اپنی محبّت کی کمی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ محبّت اگر پُختہ ہو جائے تو رقابت کی ہمیں کیا پڑی

کہ کوئی اور بھی اُس سے محبّت کر رہا ہے۔ ہمیں تو اس سے محبّت کرنی ہی کرنی ہے تو یہ رقابت ہوتی ہے وہاں جہاں انسان کا اپنا محبّت کا جذبہ مضمحل ہو تو اللہ تعالیٰ نے چُن لیا محمّدؐ کو تو اب ہم بیٹھے رہیں مروڑ کھاتے اندر ہی اندر۔ یہ کیا ہُوا ان (محمّدؐ) میں کوئی سُرخاب کا پَر لگا ہُوا تھا۔ یہ کیوں لے لیے گئے اور ہمیں کیوں محروم کر دیا گیا۔ تو یہ نہیں کیا ابوبکرؓ۔ اب چوائس CHOICE ہے۔ اللہ تعالیٰ کا کہ جسے چاہے پسند کرے۔ یہ اُس کی اپنی پسند ہے تو جس کو اللہ تعالیٰ سے محبّت ہے تو وہ اُس کی پسند سے کیسے ناراض ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سے محبّت ہے تو اللہ تعالیٰ کی محبّت یہی ہے۔ لہٰذا پھر ابوبکرؓ نے جس طریقے سے اپنی نفی کی ہے۔ نفی کلّی۔ وہ فنا فی الرسول۔ اُس کا بھی مکمّل ترین معاملہ جو ہے۔ وہ ابوبکرؓ کا ہے۔ حالانکہ یہ باتیں ذرا نازک تھیں۔ عام مجمع میں کہیں جائیں تو وہ شاید توہینِ رسالت میں شمار ہو جائیں۔ دُنیاوی اعتبار سے ہر پہلو سے ابوبکرؓ آگے تھے۔ محمّدؐ سے۔ حضورؐ کے پاس اپنا کوئی سرمایہ نہ تھا۔ یتیم تھے۔ سرمایہ تھا تو بیوی کا تھا۔ اپنا تو نہیں تھا۔ ابوبکرؓ خود سرمایہ دار تھے۔ خود تاجر تھے۔ خود غنی تھے۔ خود دولت مند تھے۔ قریش کی جو بھی کوئی پولیٹکل آرگنائزیشن (سیاسی تنظیم) تھی۔ اُس کا کوئی عُہدہ حضورؐ کے پاس نہ تھا۔ ابوبکرؓ اس نظام میں عہدے دار تھے۔ بڑا نازک SENSITIVE اور بڑا اہم عہدہ۔ یعنی قتل کے مقدمات میں دیت کا فیصلہ۔ خون بہا کا فیصلہ۔ یہ ابوبکرؓ کے پاس تھا۔ تو دُنیاوی اقتدار کہہ لیں۔ وجاہت کہہ لیں۔ دولت کہہ لیں۔ ثروت کہہ لیں۔ اِن دونوں میں ابوبکرؓ آگے ہیں محمّدؐ سے۔ یہ چیز کسی اور کے لیے پاؤں کی بیڑی بن جاتی۔ یہ (محمّدؐ) ہم سے کہاں آگے ہو گئے۔ اور مَیں (ابوبکرؓ) کونسا کم تھا اِن (محمّدؐ) سے۔ مَیں (ابوبکرؓ) نے کبھی شرک نہیں کیا۔ کبھی سجدہ نہیں کیا۔ مَیں نے بھی یتیموں کی پرورش کی ہے۔ غریبوں کی سرپرستی کی ہے۔ یہ سارے اوصاف جو محمّدؐ کے ہیں۔ عناصرِ ترکیبی ہیں۔ وہ سَب کے سَب ابوبکرؓ کی سیرت میں بھی موجود ہیں۔ لیکن چُن لیا مولا نے جس کو پسند کیا۔ لیکن یہ بہت مشکل کام ہے۔ ہمارے ہاں جو اصل اس وقت شمار ہوتا ہے کہ المرءُ اخرۃ اصل المنافرۃ۔ ہمعصر ہونا ہی تو نفرت کی سب سے بڑی بُنیاد ہے۔ یہ کیوں آگے نکل جائے۔ مَیں کیوں پیچھے رہ جاؤں۔ یہی تو سارا دھندا ہے۔ ساری فرقہ واریت اِسی میں تو ہے۔"

○

۱۔ مشہور تفسیر رُوح المعانی میں علّامہ آلوسی رحمہ اللہ لکھتے ہیں۔

"الصنف الثانی الصدیقون وھم المومنون باللہ تعالیٰ ورسلہ عن قول المخبر لا عن دلیل سوی النور الایمانی الذی اعد فی قلوبھم قبل وجود المصدق بہ المانع لھا من تردد

أو شك يد خلها فی قول المخبر الرسول و متعلقه فی الحقیقة الایمان بالرسول و یکون الایمان باللہ تعالیٰ علی جهة القربة لا علی اثباته اذکان بعض الصدیقین قد ثبت عندهم وجود الحق جل وعلا ضرورة او نظرا لکن ما ثبت کونه قربة ولیس بین النبوة والصدیقیة کما قال حجة الاسلام وغیره ۔مقام۔ ومن تخطی رقاب الصدیقین وقع فی النبوة وهی باب مغلق۔ وأثبت الشیخ الاکبر قدس سره مقاما بینهما سماه مقام القربة وهو السر الذی وقر فی قطب ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ المشار الیه فی الحدیث فلیس بین النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم وابی بکر رضی اللہ عنہ رجل اصلا لا انه لیس بین الصدیقیة والنبوة مقام ... الخ"

اوّل تو بعض حضرات نے صدیقیت اور نبوّت کے درمیان مقام قربت کے وجود کا ذکر کیا ہے۔ اور جن لوگوں نے اس کے وجود کا ذکر نہیں کیا اُنھوں نے بھی یہ کہا ہے کہ من تخطی رقاب الصدیقین وقع فی النبوة یعنی جو شخص تمام صدیقین کے مرتبے سے بلند و فائق ہو جاتا ہے وہ نبوّت حاصل کرتا ہے۔ یہ مضمون ایک حدیث میں بھی ملتا ہے۔

عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ قال ان اللہ نظر فی قلوب العباد فاختار محمدا صلّی اللہ علیہ وسلّم فبعثه برسالته ثم نظر فی قلوب العباد فاختار له اصحابا فجعلهم انصار دینه و وزراء نبیه۔

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے دلوں پر نظر کی تو محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اختیار کیا اور اُن کو اپنی رسالت کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ پھر دوبارہ بندوں کے دلوں پر نظر کی تو اُن کے لیے صحابہ کو اختیار کیا اور ان کو اپنے دین کے مددگار اور اپنے نبی کے وزراء بنایا۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کا انتخاب اس بناء پر ہوا کہ دل کے اعتبار سے بھی آپ سب پر فائق تھے۔ جن صاحب نے یہ مذکورہ تقریر کی ہے اُنھوں نے بات کو سمجھا ہی نہیں۔ غرض اُن کی یہ تقریر بالکل غلط ہے اور جہالت ہے

قرآنِ پاک کی سورہ انعام میں ایک آیت ہے اللہ اعلم حیث یجعل رسالته اس کے تحت علّامہ آلوسی رحمہ اللہ لکھتے ہیں فقد جرت عادة اللہ تعالی ان یبعث من کل قوم أشرفهم وأطهرهم جبلة اللہ تعالیٰ کی عادت یہی جاری ہے کہ ہر قوم میں سے اس کے سب سے

شریف و بزرگ ترین اور جبلی طور سے سب سے زیادہ پاکیزہ کو مبعوث فرماتے ہیں) نبوت میں کیا صفات شرط ہیں ان کی تفصیل علم کلام کی مشہور کتاب شرح مقاصد میں تحریر ہے۔ خود یہی آیت اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ کس کو اپنی رسالت کے منصب سے نوازیں اس بات پر دلیل ہے کہ منصب رسالت کے لیے اہل شخص میں کچھ شرائط ہونی چاہئیں جن کا علم اللہ کو بخوبی ہے اور ان شرائط و اوصاف کی بنا پر وہ دیگر تمام لوگوں بشمول صدیقین کے مقابلے میں اس منصب کا حقیقتاً اہل ہوتا ہے۔

سوال نمبر۲

میرے ایک جاننے والے دوسرے شہر میں بینک میں مینجر ہیں۔ مَیں جب بھی اُس شہر میں جاتا ہوں تو اُن کے اصرار کے باوجود اُن کے ہاں نہیں قیام کرتا۔ چونکہ مَیں نے سُن رکھا ہے کہ بینک والوں کی کمائی سود کی ہے۔ تو کیا میرا یہ اقدام اور میری یہ سوچ صحیح ہے؟

جواب

آپ کا اقدام اور سوچ صحیح ہے۔

سوال نمبر۳

کیا گھر میں ٹی وی رکھنا جائز ہے جبکہ اہل خانہ میں مرد حضرات غیر محرم عورتوں کو دیکھتے ہیں اور اسی طرح عورتیں غیر محرم مردوں کو دیکھتی ہیں۔ بھلے ٹی وی صرف اور صرف خبریں دیکھنے کے لیے ہی استعمال ہوتا ہے۔

جواب

ٹی وی گھر میں رکھنا ہی صحیح نہیں ہے خواہ صرف خبروں ہی کی خاطر ہو۔ شریعت کی رو سے اُس کی بُرائیاں اتنی واضح ہیں کہ محتاج بیان نہیں۔

سوال نمبر۴ | غلّہ منڈی میں بیٹھ کر سٹاکسٹ کا کاروبار (آڑھت کا نہیں) کرنا جائز ہے؟ جب کہ تمام خرید شُدہ جنس کی تمام قیمت نقد ادا کر دی جائے اور جنس کو ایک جگہ سے اُٹھا کر اپنے گودام میں سٹاک کر لیا جائے اور دو چار ماہ کے بعد جب بھاؤ تیز ہو جائے تو جنس کو منڈی میں لے آئے۔

جواب | اگر اس طرح کرنے سے بازار میں جنس کی کمیابی اور گرانی واقع نہیں ہوتی تو جائز ہے۔ ورنہ نہیں۔

مولانا نعیم الدّین صاحب

فاضل و مدرس جامعہ مدنیہ

ثمرات الاوراق

انقلابات زمانہ

قارئین محترم عادت اللہ جاری ہے کہ ایّام (دن) ہمیشہ ایک جیسے سے نہیں رہتے بدلتے رہتے ہیں، کبھی دُکھ ہے کبھی سُکھ ہے، کبھی رنج ہے کبھی راحت ہے، کبھی نرمی ہے کبھی سختی ہے، کبھی غمی ہے کبھی خوشی ہے، کبھی عزّت ہے کبھی ذلّت ہے، کبھی امیری ہے کبھی غریبی ہے، کبھی اقبال ہے کبھی ادبار ہے، کبھی ترقی ہے کبھی تنزل ہے، کبھی عروج ہے کبھی زوال ہے، کبھی شاہی ہے کبھی گدائی ہے، کبھی تختِ سلطنت ہے تو کبھی تختۂ دار ہے، قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے اسی حقیقت کی طرف توجّہ دلائی ہے۔

ارشاد باری ہے "وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ" (۳ : ۱۴۰)

اور یہ دن باری باری بدلتے رہتے ہیں ہم ان کو لوگوں میں۔ (ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ)

کہتے ہیں تاریخ اپنے آپ کو دوہراتی ہے، چنانچہ تاریخ میں ہمیں زمانے کے ایسے ایسے انقلابات نظر آتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ایسے لوگ جو عزّت و افتخار کے بلند مقام پر فائز تھے۔ انقلاب زمانہ سے وہ ایسے گرے کہ تماشہ گاہِ عالم بن کر رہ گئے، ایسے لوگ جن کی داد و دہش سے ہر انسان فائدہ اُٹھاتا تھا، وہ ایسے مُفلس و قلّاش ہُوئے کہ نانِ جویں کے محتاج ہو گئے، تاریخ کے حوالے سے چند واقعات نذر قارئین کیے جاتے ہیں۔

بنو امیّہ کے آخری تاجدار کی بیوی خلیفہ محمّد مہدی کے محل میں

"ایک مرتبہ خلیفہ مہدی کی بیوی خیزران اور دوسری خواتین شاہی محل میں بیٹھی تھیں کہ خادم نے آکر اطلاع دی کہ ایک شریف مگر بدحال عورت دروازے میں کھڑی ہے، اندر آنے کی اجازت چاہتی ہے، لیکن اپنا نام اور کام نہیں بتاتی، خیزران نے خادم سے کہا کہ اس سے کہو اندر آ جائے، عورت اندر آ گئی۔ وہ پھٹے پُرانے کپڑوں میں تھی، لیکن بشرہ پر شرافت کا جمال نمایاں تھا، خیزران نے

پُوچھا بہن تم کون ہو؟ اس نے کہا میں مروان بن محمد (آخری اموی خلیفہ) کی بیوی مزنۃ ہوں، زمانہ نے مجھے اس حالت کو پہنچا دیا ہے، میرے جسم پر تم یہ جو پُرانے کپڑے دیکھ رہی ہو یہ بھی میرے نہیں ہیں مانگے کے ہیں گو زمانہ نے ہم کو اس نوبت کو پہنچا دیا ہے، لیکن اب بھی ہماری شرافت کا وقار ہم کو عام لوگوں سے ملنے کی اجازت نہیں دیتا، اس لیے ہم تمہارے پاس آئے ہیں کہ ہماری جو نوبت بھی ہو تمہارے پردہ میں ہو، مزنۃ کی باتیں سُن کر خیزران کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں، لیکن اُس کی مغلانی زینب (جو بڑی مُنہ چلی تھی) اس کی طرف دیکھتے ہُوئے بولی مزنۃ تم وہ دن بھول گئیں جب ہم حرّان میں تمہارے پاس امام ابراہیمؒ[1] کی لاش مانگنے کے لیے گئے تھے تو تم نے ہمیں ڈانٹ کر نکلوا دیا تھا اور کہا تھا کہ مردوں کے معاملات میں عورتوں کو کیا دخل، تم سے اچھا سلوک تو (تمہارے میاں) مروان نے کیا تھا کہ جب ہم اس کے پاس گئے تو اس نے قسم کھا کر امام ابراہیم کے قتل سے انکار کیا گو کہ وہ اس قسم میں جھوٹا تھا اور اُس نے لاش ہمارے حوالے کر کے مالی سُلوک بھی کرنا چاہا تھا، لیکن ہم نے خود ہی انکار کر دیا، مزنۃ نے کہا خدا کی قسم ہماری یہ حالت اسی کا نتیجہ ہے، معلوم ہوتا ہے تم اس حالت کو اچھا سمجھتی ہو، جبھی خیزران کو ایسے کام پر اُبھار رہی ہو جس میں ہم مبتلا ہو کر اس نوبت کو پہنچ گئے ہیں، تمہیں تو چاہیے تھا کہ اسے نیکی اور بھلائی پر آمادہ کرتیں اور بُرائی کے بدلے میں بُرائی کرنے سے روکتیں تاکہ خُدا نے جو نعمت تم کو عطا کی ہے وہ باقی اور قائم رہے اور اس کے ذریعہ سے دین کی حفاظت ہو، بہن زینب تم دیکھ رہی ہو کہ خُدا نے دوسروں کی حق تلفی اور ان کے ساتھ بدسلوکی کا ہم سے بدلہ لیا ہے، پھر بھی تم ہماری ہمدردی سے اجتناب برتتی ہو، یہ کہہ کر وہ روتی ہُوئی اُٹھ کھڑی ہُوئی (خیزران دل میں بہت متأثر ہُوئی) لیکن وہ زینب کی مخالفت کو اچھا نہیں سمجھتی تھی (اس لیے ظاہری اخلاق نہ برت سکی) اور ایک لونڈی کو اشارہ دیا کہ وہ چپکے سے کمرے میں لے جا کر کپڑے وغیرہ بدلوا دے۔ خلیفہ مہدی محل میں آیا، تو اُس وقت زینب جا چکی تھی، خلیفہ کی عادت تھی کہ وہ ہر روز شام کو اپنی خاص خواتین کے ساتھ وقت گزارتا تھا۔ خیزران نے دن میں پیش آنے والا سارا قصّہ اُس کو سُنایا، اُس نے اسی وقت

---

[1] حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے پوتے محمّد بن علی کے صاحبزادے تھے۔ والد کی وفات کے بعد اُن کے جانشین ہُوئے اور عباسی تحریک (جو بنو اُمیّہ کے خلاف تھی) کی قیادت اُن کے سُپرد ہُوئی۔ خلافتِ بنو اُمیّہ کے خلاف تحریک چلانے کے جُرم میں قید کر کے پھانسی پر چڑھائے گئے اور کئی دن اُن کی لاش پھانسی پر لٹکتی رہی زینب نے اسی کا تذکرہ کیا ہے۔

لونڈی کو بُلا کر پُوچھا کہ کمرہ میں جانے کے بعد مزنۃ کیا کہہ رہی تھیں، اس نے کہا امیر المؤمنین وہ رو رو کر قرآن مجید کی یہ آیت پڑھ رہی تھیں۔

"وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ آمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّأْتِيهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِأَنْعُمِ اللّٰهِ فَأَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوا يَصْنَعُونَ" (۱۶ - ۱۱۲)

اور اللہ تعالیٰ نے ایسی بستی کی مثال بیان کی جو امن و چین سے تھی، اُس کے پاس ہر جگہ سے فراغت سے رزق آتا تھا۔ پس اس نے اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کی، اس کی سزا میں اللہ تعالیٰ نے اسے بھوک اور خوف کا مزہ چکھایا،

یہ سُن کر وہ زار و قطار رونے لگا اور خُدا کے حضور میں دُعا کی۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ زَوَالِ النِّعْمَةِ" الٰہی مَیں زوالِ نعمت سے پناہ مانگتا ہُوں اور خیزران سے کہا کہ اگر تم مزنۃ کے ساتھ اچھّی طرح سے پیش نہ آئی ہوتیں تو مَیں تم سے کبھی نہ بولتا اور زینب کے فعل کو بہت بُرا جانا اور کہا کہ زینب اگر ہماری بڑی بُوڑھیوں میں سے نہ ہوتی تو مَیں اس سے کبھی بھی کلام نہ کرنے کی قسم اُٹھا لیتا، پھر ایک لونڈی کے ذریعہ مزنۃ کے پاس سلام کے بعد یہ پیام کہلا بھیجا کہ بنتِ عم اس وقت تمہاری سب (دینی) بہنیں میرے پاس جمع ہیں ایسی حالت میں اگر میرا آنا تمہارے پاس تم کو غمزدہ نہ کر دیتا تو مَیں خود آتا۔ مزنۃ اس پیام کا مطلب سمجھ گئیں اور دامن سمیٹتی ہُوئی خود چلی آئیں مہدی نے اُنہیں مرحبا کہا اور اپنے پاس بٹھایا اور دیر تک اُن کے خاندان کی تباہی پر ہمدردانہ گفتگو کرتا رہا اور کہا اگر میں تمہارے خاندان میں شادی کرنا پسند کرتا تو ضرور تمہارے ساتھ شادی کر لیتا، لیکن ایسا نہیں کر سکتا اس لیے بہتر ہے کہ تم مجھ سے پردہ کرو اور اپنی بہنوں (عباسی خواتین) کے ساتھ محل میں رہو، جو سلوک اُن کے ساتھ کیا جا رہا ہے وہی تمہارے ساتھ کیا جائے گا، چنانچہ مزنۃ کے آرام و راحت کا تمام سامان مہیّا کر دیا، اس میں اور خاندانِ شاہی کی خواتین میں کوئی فرق نہ کیا حتّٰی کہ اُن کے برابر جاگیر بھی اُن کو دے دی، مزنۃ نے آرام و راحت، عزّت و آبرو کے ساتھ اس محل میں پوری عمر گزاری اور ہارون رشید کے زمانہ میں انتقال کیا۔[1]

---

[1] مروج الذہب ج ۳ ص ۳۲۳ تا ۳۲۵

جعفر برمکی کی والدہ مسجد کوفہ کے پیش امام کے گھر میں سوالی بن کر

جعفر برمکی خلیفہ ہارون رشید کا وزیر اعظم اور اس کے لڑکے مامون کا اتالیق تھا، جعفر کی وجہ سے برامکہ کو یہ اقبال حاصل ہوا کہ بڑے بڑے امراء و عمائد اُن کی آستان بوسی کو فخر سمجھتے تھے اُن کی زرپاشیوں نے دجلہ کے بالمقابل سونے اور چاندی کا دریا بہا دیا تھا، ان کا محل فقیروں اور مسکینوں کا ملجا و ماویٰ تھا، علماء شعراء اور دوسرے اربابِ کمال ان کی فیاضیوں سے مالا مال تھے، یا یہ اِدبار آیا کہ جعفر کی ماں عبادۃ جس کی خدمت میں چار چار سو کنیزیں رہتی تھیں عین عید کے دن پھٹے پُرانے کپڑوں میں محمد بن عبدالرحمٰن امام مسجدِ کوفہ کے گھر معمولی امداد کے لیے نظر آتی ہے، چنانچہ محمد بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں۔

میں بقرہ عید کے موقعہ پر والدہ سے ملنے گیا تو دیکھا کہ ایک شریف عورت پھٹے پُرانے کپڑوں میں والدہ سے بات چیت کر رہی ہے۔ والدہ بولیں کہ اس عورت کو جانتے ہو؟ مَیں نے کہا نہیں، کہنے لگیں کہ یہ جعفر بن یحییٰ برمکی کی والدہ عُبادۃ ہے، مَیں نے اس سے بات چیت اور اس کی تعظیم کے خیال سے اپنا رُخ اُس کی طرف کر لیا، اور کہا کہ اماں جی آپ کا یہ عجیب حال، مَیں کیا دیکھ رہا ہُوں؟ وہ بولی بیٹا ایک وقت وہ تھا کہ عید آتی تھی تو چار چار سو کنیزیں میرے سرہانے کھڑی ہوتی تھیں، مَیں پھر بھی اپنے بیٹے کو اپنا نافرمان شمار کرتی تھی، اور ایک اب یہ عید آئی ہے جس میں میری تمنّا فقط یہ ہے کہ دو بکریوں کی کھالیں مل جائیں تو اُن میں سے ایک کو گدا اور دوسری کو رضائی بنا لوں محمدؐ بن عبدالرّحمٰن کہتے ہیں کہ مَیں نے اسے پانچ سو روپے دے دیے وہ اتنی خوش ہُوئی قریب تھا کہ خوشی کے مارے مر جاتی۔ پھر وہ ہمارے ہاں آتی جاتی رہی حتیّٰ کہ موت نے ہمارے درمیان جُدائی ڈال دی۔" [1]

فقیر کو جھڑکنے والا خود فقیر بن گیا

شہاب الدّین محمد بن احمد اَبْشَہی لکھتے ہیں۔

"ایک مرتبہ ایک شخص اپنی بیوی کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا رہا تھا، سامنے بھنی ہُوئی مُرغی بھی رکھّی تھی، اچانک ایک فقیر نے دروازے پر آ کر صدا لگائی۔ وہ شخص دروازے کی طرف گیا اور اس فقیر کو خُوب جھڑکا فقیر یونہی واپس چلا گیا، خُدا کا کرنا ایسا ہُوا کہ کچھ عرصے بعد یہ شخص خود فقیر ہو گیا، سب نعمتیں ختم ہو گئیں، بیوی کو بھی طلاق دیدی۔ اُس نے کسی اور سے نکاح کر لیا، پھر ایک دن ایسا ہُوا کہ یہ میاں بیوی اکٹھے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے اور بھُنی ہُوئی مُرغی سامنے تھی کہ کسی فقیر نے دروازہ کھٹکھٹایا

---

[1] مروج الذہب ج ۳ ص ۳۹۲

میاں نے بیوی سے کہا کہ یہ مُرغی اس فقیر کو دے آؤ چنانچہ وہ مُرغی لے کر دروازے کی طرف گئی تو کیا دیکھتی ہے کہ فقیر اُس کا پہلا شوہر ہے۔ خیر مُرغی اُسے دے کر واپس لوٹی تو رو رہی تھی۔ میاں نے پُوچھا کہ کیوں رو رہی ہو بولی کہ فقیر تو میرا پہلا میاں تھا، غرض پھر سارا قصّہ اُسے سُنایا جو ایک فقیر کو جھڑکنے سے پیش آیا تھا اس کا میاں بولا خُدا کی قسم وہ فقیر میں ہی تھا۔"[1]

ان واقعات سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اگر خُدا ہمیں کوئی منصب کوئی عہدہ، یا مال و دولت دے تو اُس پر مغرور نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ یہ سب چیزیں آنی جانی ہیں۔ آج ہیں کل نہیں، خُدا جانے آج جو حالات ہیں وہ کل تک باقی رہتے ہیں یا نہیں، پھر کس برتے پر انسان گھمنڈ کرے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

---

[1] فی کل فن مستظرف ج ۱ ص ۱۰

بقیہ: جمہوریت

رحمۃ للعالمین صلّی اللہ علیہ وسلّم نے استعمال فرمایا، کیونکہ مقصد رحمت اس وقت تک پُورا نہیں ہوتا جب تک ظلم کی طاقتیں پامال نہ ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ تمام عالم پر چتر رحمت اسی وقت سایہ فگن ہو سکتا ہے۔ جب بین الاقوامی سیاست میں بالادستی اور شانِ قیادت حاصل ہو۔ ہم سود کو بدترین ظلم سمجھتے ہیں، مگر ہم تمام احتیاطوں کے باوجود سود لیتے بھی ہیں اور دیتے بھی ہیں، کیونکہ جس اقتصادی نظام میں ہم جکڑ بند ہیں وہ بینک سسٹم ہے اور جب تک اقتصادیات عالم کی باگ ڈور آپ کے ہاتھ میں نہ ہو آپ بینک سسٹم ختم کر کے کوئی متبادل نظام قائم نہیں کر سکتے۔

سود کے متعلق قرآن حکیم کا فیصلہ دستور اساسی کی ایک دفعہ ہے۔ مجلس شوریٰ اس میں تبدیلی نہیں کر سکتی، البتّہ متبادل صورتیں طے کرنا اور ان کو نافذ کرنا اس کا فرض ہوگا۔ مگر افسوس اس وقت دنیا میں مُسلمانوں کی کوئی حکومت بھی اس قابل نہیں کہ بین الاقوامی سیاست پر اثر انداز ہو سکے اور افسوس یہ ہے کہ ان کو اس کا احساس بھی نہیں کہ حامل قرآن ہونے کی حیثیت سے اُن کا کیا فرض ہے۔ والی اللہ المشتکی۔

انوار مدینہ

نہ پہنچنے یا تاخیر سے پہنچنے کی شکایت محترم حافظ محمّد یعقوب صابر صاحب کو مینجر "انوار مدینہ" جامعہ مدنیہ کریم پارک راوی روڈ لاہور سے کی جائے۔ خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیا جائے۔ ——— (ادارہ)

سرگزشت

محمّد علی خان بریلوی

عُرف جیمی گرین

انہیں باتوں سے ہم لوگ سخت نفرت کرتے ہیں۔ جب تک آپ ہم لوگوں کی زبان نہ سیکھیں اور شرفاء سے میل جول پیدا نہ کریں، اُس وقت نہ آپ جان سکتے ہیں، اور نہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایسے کندۂ ناتراش سے آپ کی قومی عظمت اور ناموری پر کتنا بڑا دھبّہ لگتا ہے۔ ایسی ہی مثالیں آپ کے وہ دُشمن اپنے دعووں کی تصدیق میں پیش کیا کرتے ہیں جو اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے کو آپ کی قوم کی رعونت اور خودغرضی کا ذکر کر کے آپ کے فیاضانہ خیالات اور ہمدردی کو محض دھوکے کی ٹٹی ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ مَیں نے کمپنی کی ملازمت روپیہ کے خیال سے نہیں بلکہ معزّز عہدہ حاصل کرنے کی اُمّید پر کی تھی، مگر بسم اللہ ہی غلط ہُوئی۔ اس لیے کہ میں جس کی صُورت سے متنفّر تھا، اُسی کی ماتحتی میں دیا گیا مَیں نے تھوڑے دنوں کے بعد اپنے والد کو لکھا کہ اگر آپ اجازت دیں تو مَیں استعفٰے دے دوں۔ وہ راضی ہو گئے اور کہا کہ نسل ملوک سے ہو، ان صورتوں میں ہرگز نوکری مت کرو۔ میں فوراً ملازمت چھوڑ کر چلا آیا، اور ارادہ کیا کہ نصیر الدین حیدر شاہِ اودھ کی نوکری اختیار کروں۔ لکھنؤ میں پہنچتے ہی سُنا کہ مہاراجہ جنگ بہادر والیِ نیپال آج کل گورکھ پور میں لکھنؤ کے خلاف تیاّری کر رہے ہیں اور انگلستان جانے کے لیے ایک لائق انگریزی داں سیکرٹری چاہتے ہیں۔ مَیں نے فوراً درخواست دی اور بڑی سفارشوں سے اس عہدہ پر مقرر ہو گیا اور مہاراجہ صاحب بہادر کے ہمراہ اوّل دفعہ انگلینڈ گیا۔ منجملہ دیگر مقامات کے ایڈنبرا بھی دیکھا جہاں آپ کی بھی رجمنٹ مہاراج کے استقبال کو آئی تھی۔ مجھے خود بخود خیال ہُوا کہ یہ پلٹن کسی دن ضرور مجھے قید کرے گی۔ چنانچہ وہی ہُوا۔ مَیں ہندوستان واپس آکر بعض رجواڑوں میں بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز رہا اور ۱۸۵۴ء میں عظیم اللہ خاں نے جس کا نام آپ نے غدر کے سلسلے میں بہت کچھ سُنا ہو گا، مجھ

سے انگلستان چلنے کو کہا۔ بعد وفات پیشوا، نانا راؤ نے عظیم اللہ خاں کو اپنا سربراہ مقرر کیا تھا۔ اُس نے بھی میری طرح ماسٹر گنگا دین سے گورنمنٹ سکول کانپور میں انگریزی خُوب تحصیل کی تھی اور اُسے قوی اُمّید تھی کہ انگلستان پہنچ کر ضرور لارڈ ڈلہوزی کا حکم اپنے آقا پر منسوخ کرالوں گا۔ جب مَیں اُن کے پاس پہنچا تو وہ ولایت جانے کو پا برکاب تھے، اُن کو بہت سا روپیہ اس غرض سے دیا گیا تھا کہ حسبِ دل خواہ وکیل کریں اور درصورت ضرورت حکام کی مُٹھی بھی گرم کریں۔ مَیں اس سفارت کا حال آپ کو بتانا نہیں چاہتا آپ خوب واقف ہیں کہ ہم لوگوں کی آؤ بھگت تو خُوب ہُوئی، مگر مطلب خاک بھی نہ نکلا اور ہم پانچ لاکھ روپیہ خراب کر کے وہاں سے چل دیئے، اور براہِ قسطنطنیہ ہندوستان کو ۱۸۵۵ء میں روانہ ہُوئے۔ قسطنطنیہ سے ہم کریمیا گئے، اور یہیں پر ہم نے دیکھا کہ ۱۸ جون کو انگریزوں نے حملہ کیا مگر شکست کھائی۔ سباسٹپول کے سامنے دونوں فوجوں کی حالتِ زار دیکھ کر ہمارے دل پر بڑا اثر ہُوا۔ میدانِ جنگ سے پھر قسطنطنیہ لَوٹے۔ یہاں ہمیں کئی رُوسی افسر ملے۔ وہ سچّے ہوں یا جھُوٹے، یہ ہم نہیں جانتے مگر وہ ہم سے کہنے لگے کہ اگر تم لوگ ہندوستان میں غدر پھیلا دو تو ہم ہر طرح مدد کریں گے اور تمہارا بڑا فائدہ ہوگا۔ اَب تو مَیں نے اور عظیم اللہ خاں نے ارادہ کر لیا کہ کسی طرح کمپنی کا راج سرزمینِ ہندوستان سے کھو دیں، اور خُدا کا شُکر ہے کہ ہم اس بارہ میں کامیاب بھی ہو گئے کیونکہ ان اخبارات سے جو آپ نے عنایت فرمائے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ کمپنی کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور اَب اُن کو لوٹ مار اور ضبطی کے لیے فرمان نہ ملے گا۔ اگرچہ ہم انگریزوں سے ملک نہ چھین سکے، لیکن تب بھی ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے ملک کو کچھ فائدہ ضرور پہنچایا ہے اور ہماری جانیں بے فائدہ تلف نہ ہوں گی، کیونکہ مَیں یہ یقینی جانتا ہُوں کہ پارلیمنٹ کی حکومت کمپنی کے راج سے زیادہ عادلانہ ہوگی۔ گو کہ مَیں اس زمانہ میں زندہ نہیں ہوں گا لیکن ہمارے مظلوم اور مصیبت زدہ ہم وطن کسی آئندہ وقت میں ضرور زیادہ امن و چین سے زندگی بسر کریں گے۔ صاحب! اس بات کو آپ خُوب سمجھ لیں کہ مَیں جو کچھ کہہ رہا ہُوں وہ ہرگز نہ تو آپ کی خوشامد کے خیال سے ہے اور نہ اس اُمّید پر کہ آپ مجھ پر زیادہ مہربانی کریں گے۔ اس لئے کہ یہ تو مجھے حاصل ہی ہے، اور مَیں خُوب جانتا ہُوں کہ اس سے بڑھ کر آپ کر بھی نہیں سکتے اور اگر کرنی چاہیں تو آپ کو ادائے فرضِ منصبی کا خیال کبھی ہرگز نہیں کرنے دے گا۔ یہ تو صاف

ظاہر ہی ہے کہ ہماری موت آ پہنچی ہے لیکن جو غیر مترقبہ احسان آپ نے میرے ساتھ کیا ہے اس کی وجہ سے میں دل کھول کر آپ سے باتیں کر رہا ہوں۔ اس ڈیرہ کی طرف آتے ہوئے تو ضرور میں دل میں گالیاں دیتا اور بُرا کہتا آتا تھا، مگر آپ کی دوبارہ عنایتوں کو دیکھ کر دل میں بہت خفیف اور شرمندہ ہوں اور افسوس کرتا ہوں کہ ایّام غدر میں کیوں اس قدر کشت وخون ہوا۔ اوّل موقع وہ تھا جب کرنیل نیپئر صاحب انجنیئر کانپور گھاٹ پر حال ہی میں کچھ ہندوؤں کے مندر گروا رہے تھے کہ چند ہندو پجاری اُن کے پاس آئے اور ملتجی ہوئے کہ مندروں کو نہ تڑوائیے کرنیل صاحب نے جواب دیا۔ "سُنیے صاحب! جب میمیں اور بچّے قتل ہوئے تو آپ سب یہیں تھے اور یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ ہم بدلہ لینے کے خیال سے مندروں کو نہیں ڈھا رہے ہیں، بلکہ کشتیوں کے پُل اور فوجی حفاظت کے خیال سے ایسا کر رہے ہیں، لیکن اگر ایک متنفّس بھی تم میں سے یہ بات ثابت کر دے کہ تم نے کسی ایک بھی انگریز، بچّہ، میم کے ساتھ ذرا سا بھی سلوک کیا ہے، اور یہ بھی نہیں بلکہ اتنا بتلا سکو کہ ایک لفظ بھی کسی کی جان بچانے کو کہا ہے تو مَیں ذمّہ لیتا ہوں کہ جہاں ایسا شخص پُوجا کیا کرتا ہے، مَیں اس مندر کو بجنسہٖ قائم رہنے دوں گا۔" مَیں اس مجمع میں کرنیل کے قریب ہی کھڑا تھا اور دل میں اُن کی باتوں پر کہہ رہا تھا۔ ع

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

اس تقریر پر سب دم بخود ہو گئے اور سارے برہمن وہاں سے کھسک گئے کرنیل صاحب نے اشارہ کیا اور مندر ٹوٹنا شروع ہو گئے۔

(جاری ہے)

ماہنامہ
انوارِ مدینہ
لاہور

اِس دینی رسالہ سے آپکا تعاون آپ کے اَجر اور اسکے اِستحکام، بقاء، اور ترقی کا باعث ہوگا۔

★ اِس کے خریدار بنیئے اور دوسروں کو خریدار بنائیے۔
★ اِس میں اشتہار دیجئے اور دوسروں سے دلوائیے۔
★ اِس کے لیے مضامین لکھیئے اور اپنے مضمون نگار دوستوں کو اس کیلئے مضمون لکھنے کی ترغیب دیجئے۔